itsurdu.blogspot.com
نیا ایڈیشن
جیل کے دن
جیل کی راتیں
تصنیف
ابراھیم جلیس
Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com
www.wadi-e-urdu.com
itsurdu.blogspot.com
ANWAR
itsurdu.blogspot.com

ابراہیم جلیس

مکتبۂ جلیس

ناشر ——— کنیز فاطمہ جلیس

مطبع ——— مشرق پریس

قیمت ——— پندرہ روپئے

نیا ایڈیشن ——— ۱۹۷۹ء

تعداد ——— ایک ہزار

مقامِ اشاعت

مکتبہ جلیس

۲۱ بہادر شاہ مارکیٹ

ایم اے جناح روڈ، کراچی

فون ——— ۲۱۵۰۹۸

برادرم محمد یعسوب الحسن کے نام

جسے انگریزی سامراج کے خلاف
جنگِ آزادی میں چھ بار آہنی سلاخوں
اور سنگین دیواروں کے جہنم میں جھونکا
گیا لیکن جب بھی اس کو ہتھکڑیاں
لگائی گئیں وہ بے تحاشا قہقہے لگاتا رہا۔

(۱)

وہ پہلی مارچ ۱۹۵۰ء کا نہایت خوشگوار اور بے حد منحوس دن تھا!

صبح سویرے جاگتے ہی آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ الٰہی خیر ـــــ میں توہم پرست تو نہیں ہوں مگر جانے کیا بات ہے کہ جس دن بھی اپنی صورت آئینے میں دیکھ لیتا ہوں۔ اس دن کسی حادثے یا سانحہ کا شکار ضرور ہوتا ہوں۔ جبھی تو زندگی ہر روز کسی نہ کسی حادثے اور سانحے سے گزرتی چلی آئی ہے۔ غسل، ناشتہ، اخبار اور سگرٹوں سے فارغ ہوا تھا کہ ایک بچے نے دوسرے کی ناک پکڑ لی۔ دوسرے نے رونا شروع کیا تیسرے نے رونے والے کی حمایت میں پہلے کے ایک دھول رسید کر دی۔ پہلا بھی رونے لگا ـــــ اور روتا رہا۔ بچوں میں بالعموم ایک ٹیم

سپرٹ" ہوتی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ پانچوں کے پانچوں نے مل کر محفلِ آہ و زاری گرم کر دی اور میں ان کے لئے چاکلیٹ اور مٹھائی وغیرہ لینے کے لئے گھر سے باہر نکل گیا۔

باہر سڑکوں پر بڑی رونق تھی، سڑکیں، دکانیں، مکان اور ہوٹلیں خوب سجائی سنواری گئی تھیں۔ فٹ پاتھوں پہ دو رویہ آدمی کھڑے تھے اور اوپر مکانوں کی چھتوں اور بالکونیوں پر سپید بلورین، سرخ، سانولی، کالی، پیلی عورتوں کی کہکشاں تنی ہوئی تھی۔ فٹ پاتھوں پر جمع شدہ مرد جو دراصل شاہِ ایران کو دیکھنے آئے تھے فی الحال انہیں دیکھ رہے تھے۔ اور میں کسی پرانے شاعر کا ایک نہایت بے ہودہ سا مصرع گنگناتا کیفے جارج میں داخل ہوا۔ بلیک میجک ٹافی کا ایک ڈبہ اور جان پیرز کے چاکلیٹ خرید کر باہر نکلا تو چند حیدر آبادی دوست مل گئے اور بڑی بے تکلفی سے دعوت دی کہ۔

"آؤ نا حضت ـــــ ذرا شاہِ ایران کو بھی دیکھیں گے"۔

میں نے بھی خالص حیدر آبادی لہجہ میں جواب دیا۔

"جی ہو، چلیئے"۔

شاہِ ایران کے آنے میں ابھی کوئی دو گھنٹے باقی تھے۔ ایک واچ میکر کی چھوٹی بڑی گھڑیاں ایک بجا رہی تھیں اور ہم الفنسٹن اسٹریٹ پر سے

گذر ہے تھے تاکہ گورنر جنرل ہاؤس جائیں اور وہاں سے شاہی جلوس دیکھیں ابھی ہم "باب لیاقت" تک پہنچے تھے کہ پیچھے سے پتلون اور قمیص میں ملبوس ایک شخص آیا۔ اور اس نے مجھ سے کہا۔

"ذرا ایک بات تو سنیئے":

میں سمجھا کہ میرا کوئی دوست ہے یا کوئی پرستار، جو الگ جا کر میری ادبی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہے۔ مجھے کسی کیفے یا ریسٹوران میں دعوت دینا چاہتا ہے، اور شاید میرا آٹوگراف بھی لینا چاہتا ہے۔

میں اسکے ساتھ فٹ پاتھ پر ایستادہ ہجوم کے پیچھے چلا آیا۔ اس شخص نے کہا

"مجھے افسوس ہے لیکن کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ آپ خود ہی سامنے آگئے ابھی تین چار روز تک میرا ارادہ نہیں تھا ہم شاہِ ایران کی آمد کے سلسلے میں بہت مصروف تھے اچھا خیر ـــــ لیجیے' یہ آپ کا وارنٹ گرفتاری ہے۔ اس پر دستخط کر دیجیے"۔

دستخط۔ ! آٹوگراف یعنی !! ۔ دو تین لمحے کے لئے تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے پیروں تلے زمین نہیں ہے۔ یا پھر میں بغیر پیراشوٹ کے کسی گرتے ہوئے ہوائی جہاز سے کود پڑا ہوں ـــــ میرے حواس جو دور خلاؤں میں پرواز کر گئے تھے۔ پھر واپس آئے اور میں نے چہرے پر مصنوعی اطمینان

کی جھلک پیدا کرتے ہوئے وارنٹ لیا اور پڑھنا شروع کیا۔

آفس آف دی ایڈمنسٹریٹر آف کراچی

نمبر ۲/ ۵/ ۹/ ایس پی، آئی، ڈٹن کراچی

۲۸ فروری سنہ ۱۹۵۰ء

آرڈر

میں ایس ہاشم رضا ایڈمنسٹریٹر آف کراچی، مطمئن ہوں کہ ابراہیم حسین خان جلیس خلف احمد حسین خان کو پبلک سیفٹی اور امن عامہ کے خلاف حرکات سے باز رکھنے کے لیے حسب ذیل حکم جاری کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا ان اختیارات کے تحت جو مجھے فقرہ الف سب سیکشن (۱) سیکشن (۲) سندھ پبلک سیفٹی ایکٹ ۱۹۴۹ء سے حاصل ہیں حکم دیتا ہوں کہ شخص مذکور ابراہیم حسین جلیس خلف احمد حسین خان کو اس کے یوم گرفتاری سے چھ ماہ تک حراست میں رکھا جائے۔

ایس ہاشم رضا

میں نے اتنا پڑھ کر وارنٹ انہیں واپس کر دیا کہ ابراہیم حسین خان میرا نام نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ مگر اس بندۂ خفیہ پولیس نے کمال بے تکلفی سے جواب دیا۔

"اچھا نام پھر ٹھیک کریں گے۔ فی الحال تو چلئے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک وکٹوریہ گاڑی بلالی۔ ہم دونوں کی معیت میں ایک اور سی۔آئی۔ڈی بزرگ گاڑی میں تشریف فرما ہوئے۔ میں نے بڑی ہی لجاجت سے ان دونوں اصحاب سے کہا۔

"دیکھئے میں گرفتاری سے نہیں گھبراتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ میرے بیوی اور بچے ایک سال کی طویل اور اذیت ناک جدائی کے بعد ۷ دن قبل حیدرآباد دکن سے آئے ہیں۔ ابھی ہمیں مکان تک نہیں ملا ہے ہم عارضی طور پر ایک دوست کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں اور اسے بھی ہمیں کل خالی کرنا ہے اگر آپ صرف پانچ منٹ کے لئے مجھے بیوی سے ملوا دیجئے تو مہربانی ہوگی۔"

گرگِ باراں دیدہ سی۔ آئی۔ ڈی نے جواب دیا۔

"اس وقت تو ہم شاہِ ایران کی سواری کے سلسلہ میں مصروف ہیں۔ شام کے چھ بجے حوالات آؤں گا اس کے بعد آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔ آپ ایک گھنٹہ دو گھنٹہ جتنی دیر چاہیں۔ ان سے مل سکتے ہیں۔"

میں خاموش ہو رہا اور وکٹوریہ گاڑی کنٹونمنٹ صدر کے تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی۔

ایک انسپکٹر پولیس نے میری تلاشی لی اور حسبِ ذیل سامان تھانے کے خزانچی کے پاس جمع کرا دیا۔

۱۔ پارکر فاؤنٹن پین

۲۔ ٹافی کا ڈبہ۔

۳۔ چاکلیٹ کا پیکیٹ

۴۔ رسالہ "ایشیا" بمبئی

۵۔ رسالہ "محاذ" بمبئی

۶۔ نقد ۲۲ روپے ساڑھے نو آنے

اس کے بعد مجھے "لاک اپ" کے پاس لے جایا گیا۔ ایک سپاہی نے کہا۔

"جوتے اتار دو!"

میں نے جوتے اتار دیئے۔

ایک اور سپاہی نے کہا "نکٹائی نکال دو!"

میں نے کہا۔ "نکٹائی کیوں نکال دوں؟"

اس نے کہا۔ "کیا پتہ تم اندر جاکر پھانسی ڈال لو۔"

مجھے اس بات پر غصّہ تو بہت آیا۔ لیکن خاموش ہو رہا۔ نکٹائی اس کے حوالے کر دی جس کو اس نے اپنی نیکر کی جیب میں رکھ لیا۔

جیسے ہی لاک اپ" کا دروازہ کھولا گیا۔ اندر سے غنڈوں کی آوازیں آئیں۔ "نئے بھئی، ایک جنٹلمین ڈاکو آگیا۔"

اندر بارہ غنڈے تھے۔ سب کے سب مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے اور میرے

جسم پر رونگٹے سے کھڑے ہو گئے۔

"لاک اپ" کوئی تقریباً ۲۰ فٹ لمبا اور ۱۲ فٹ چوڑا تھا جس کے ایک کونے میں نہایت گندہ سا بیت الخلا تھا جو کمر برابر دیوار سے گھرا ہوا تھا۔

اس بیت الخلاء کے باعث "لاک اپ" میں اتنا شدید تعفن تھا کہ ناک نہ دی جائے۔ میرا سر بربو سے پھٹنے لگا۔ "لاک اپ" میں بیٹھنے کے لئے بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ تین چار ٹاٹ کے ٹکڑے تھے۔ جن پر ان غنڈوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ میں وہیں کونے میں فرش پر بیٹھ گیا میرے ساتھ جو صاحب تشریف فرما بلکہ لیٹے ہوئے تھے سخت قسم کی خارش میں مبتلا تھے۔ ان کی انگلیوں کی جوڑوں میں پیلی پیلی پھنسیاں ابھر آئی تھیں جن سے پیپ رس رہا تھا۔ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے میری ران پر ہاتھ مار کر پوچھا۔

"کچھ ہمیں بھی بتاؤ یار ـــــ کس کی جیب کاٹی۔ کدھر پکڑا گیا، کیسے پکڑا گیا"۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا، پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

الٰہی ـــ میں پاکستان اور ہندوستان کا عظیم المرتبت ادیب، اور میرے ساتھ یہ سلوک ـــــ! میرا جواب دوسرے غنڈے نے دیا۔

"معلوم ہوتا ہے بابو ابھی نوا شکاری (نیا شکاری) ہے"۔

تیسرے غنڈے صاحب صاحب نے فرمایا۔

"بابو ـــ تو اُدھر لالوکھیت میں رہتا ہے نا ـــ میں نے تجھے

دیکھا ہے۔ تو عبدالستار کی جورو کے جھگڑے میں اندر آیا ہے۔ وہ سالی بے بڑی حرام زادی"۔

میں نے ذرا کرخت لہجے میں جواب دیا۔

"میں نہ لالوکھیت میں رہتا ہوں نہ عبدالستار کو جانتا ہوں۔ اور نہ اس کی جورو کو، اور ـــــ میں ـــــ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ خاموش رہو، مجھے تنگ نہ کرو!"

اس پر ایک بھیانک شکل کے غنڈے نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا

"یارو ـــ ان کے ساتھ مذاق نہ کرو، یہ تو نازک پری جان ہیں"۔

ہی ہی ہی ہو ہو ہو ....

میرا جی چاہا کہ اپنی اور اس غنڈے کی جان ایک کر دوں۔ لیکن یہاں تو اپنی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ایک غنڈے کو بالآخر مجھ پر ترس آیا۔ اور بولا۔

"بابو، باہر تو کیا کرتا تھا؟"

میں نے اس کے لہجے میں ذرا سی ہمدردی پا کر آمیزش پا کر جواب دیا۔

"ایک اخبار میں کام کرتا تھا!"

اُس نے پوچھا۔

"کیا وہاں کچھ رقم میں گڑبڑ کر دی ـــــ!"

میں نے جواب دیا۔

"نہیں، رقم سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا ــــ غالباً ایک مضمون لکھنے کے جرم میں مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔"

ابھی میں نے جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ سارے کے سارے بارہ غنڈے ہنسنے لگے۔ ایک بولا۔

"ابے جا ــــ کس کو الو بناتا ہے۔ مضمون لکھنے سے بھی کوئی گرفتار ہوتا ہے! شرماتا کیوں ہے۔ مرد کا بچہ ہو کر بولتا نہیں، صاف صاف بول، ہاں جیب کاٹی ہے یا چوری کی ہے۔ یا فلاں عورت کو زبردستی خراب کیا ہے ــــ ارے میاں شیر کے بچے ہی پنجرے میں پھنستے ہیں۔"

میں نے بڑے سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"تم کیوں بکواس کر رہے ہو، تمہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں جب سے تم "ابے تبے" بک رہے ہو!"

اس غنڈے نے بڑے مسخرے پن سے عورت کی طرح ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

"اوئی، میری ماں، یہ موا تو مجھے کاٹتا ہے۔ میری توبہ، اوئی۔"

دوسرے غنڈے زور زور کے قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ ڈیوٹی پر سپاہی کھڑا تھا۔ اس نے سلاخوں سے جھانک کر گالی دی۔

"تمہاری ماں دی ..... کیا شور مچا رکھا ہے۔ خاموش رہو۔ ورنہ

اندر آ کر تمہاری ادھیڑ دوں گا۔"

اس ضمن میں پہلے ایک اور واقعہ بھی آپ کو سنا دوں جن دنوں میں شاہجہان ہوٹل صدر میں رہا کرتا تھا۔ میرے حیدر آبادی دوست قاضی عزیز الدین حسین صاحب کے کمرے میں چوری ہو گئی تھی۔ اور بطور گواہ کے میں ان کے ساتھ اسی تھانے پر گیا تھا۔ وہ تھانیدار جو اس چوری کی تفتیش کر رہا تھا مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی اثنا میں وہ بھی لاک اپ کی طرف آیا۔ مجھے دیکھ کر بڑا حیران ہوا اور پوچھا۔

"توں کتھے بھئی ــــ توں تو بڑا شریف آدمی دسدا ایں۔ کدھرے گٹھ تو نئیں کٹی یا عشق دے پٹیا ادیا آیاں؟"

میں نے کچھ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بڑی نفرت سے مسکراتا ہوا آگے نکل گیا۔

لاک اپ میں تو خاموشی چھا گئی۔ مگر باہر بڑا شور تھا۔ ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی اور زندہ باد کے نعرے سنائی دے رہے تھے غالباً شاہ ایران کی سواری آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے میری بیوی اور بچوں کا کیا حال ہوگا؟ ان کا یہاں میرے سوائے کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں وہ میری گرفتاری سے صرف ۲ دن قبل یہاں آئے ہیں۔ ابھی ہم نے اپنا سامان تک نہیں کھولا تھا۔ ہم ان ۲ دنوں میں کتنے سہانے خواب دیکھ

رہے تھے کہ ایک کرائے کا مکان لیں گے۔ نئے ملک میں نئی زندگی کا آغاز
کریں گے غرضیکہ ہمارے آگے آرزوؤں، امیدوں، اور تمناؤں کا ایک چمن زار
مہک رہا تھا پچھلے ڈیڑھ سالہ طویل اور ویران زندگی کے اندھیرے میں فاطمہ کے
چہرے کا چاند طلوع ہوا تھا۔ اس کی زلفوں سے الجھ کر مہکتی ہوئی ہوائیں بہار کا
پیام لائی تھیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں نے اپنی ننھی ننھی باہوں کے ہار میرے
گلے میں ڈال دیئے تھے۔ عرصہ سے ویران پڑے ہوئے خرابۂ دل میں چھ
گلاب کے پھولوں کا گلدستہ مہک رہا تھا۔ زندگی دفعتاً جیسے کسی کنواری کے
خواب کی طرح چمکیلی، رنگین اور لذت آگیں ہو گئی تھی۔ فاطمہ کی چوڑیوں کی
کھنک، بچوں کے رونے کی شر اور ان کے میٹھے میٹھے قہقہوں کی گھنٹیاں
یوں بجتی تھیں۔ جیسے ایک وسیع خشک صحرا میں ایک نیا کارواں چل پڑا
ہو۔ اس صحرا میں فاطمہ کا قد آور جسم ایک سایہ دار درخت کی طرح کھڑا
ہے جس کی آنکھوں کے چشموں میں میری عرصے کی پیاس گھل رہی ہے۔
اور ڈوب رہی ہے۔ اور جس کے سایۂ زلف میں ٹھنڈک ہے۔ سکون ہے
اور خواب ہے۔

اچانک ایک ننھے سے بچے کی رونے کی آواز سے میں چونک پڑا۔
سلاخوں کے باہر پولیس کا سپاہی ایک ننھے سے بچے کو جھڑک رہا تھا اور بچہ
رو رو کر پکار رہا تھا۔

"ابا ـــ امی ـــ ابا ـــ امی ـــ"

یہ بچہ اس ہجوم میں اپنے باپ اور ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ جو شاہ ایران
کے استقبال کی خاطر سڑک پر جمع ہوا تھا۔ مجھے اپنے بچے یاد آ گئے جنہیں روتا
ہوا چھوڑ کر جن کے لئے ٹافی اور چاکلیٹ لینے میں گھر سے نکلا تھا اور جو
اب مجھ سے جبراً چھ ماہ کے لئے بچھڑ گئے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو اتر
آئے میرا تنفس تیز ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ میرے بچے بھی چیخ رہے ہوں
گے۔ ابا۔ ابا۔ ابا۔ ان معصوموں کو ابھی معلوم بھی نہ پڑا ہوگا کہ میں کہاں
ہوں۔ اور میں ان کی آوازیں کیوں نہیں سنتا۔ کاش میرا بس چلتا اور میں
اس سپاہی سے کہتا کہ اس بچے کو یہاں سے ہٹا دو۔ سزائے قید کے ساتھ
ساتھ مجھے اتنی بھیانک ذہنی تکلیف نہ دو! خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو!

ابھی اتنا میں تین بچے اور لائے گئے۔ وہ بھی رو رہے تھے میرے
صبر و شکیب کے لئے بڑا سخت امتحان تھا۔ پولیس کا سپاہی عامیانہ
انداز میں ان بچوں کی ماؤں کو گالیاں دے رہا تھا کہ اتنی فیشن پرست ہو
گئی ہیں سالیاں کہ بچوں کا خیال ہی نہیں رکھتیں، نہ جانے کیوں پیدا کرتی ہیں
یہ ....

میں سوچ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ چھ مہینے، نصف سال! جب سے
پاکستان آیا تھا۔ اس پورے ڈیڑھ سالہ عرصہ میں میرے لئے صرف، اچھلیے

دن اور ماہتاب بکف راتیں طلوع ہوئی تھیں ۔ میری نظروں کی خلاؤں
میں پانچ ننھے ننھے ہمکتے چہرے بسور رہے تھے اور سامنے لوہے کی لمبی لمبی
سلاخیں !

کیوں رو رہے ہو میرے بچو ! میں اب تمہارے پاس نہیں آسکتا ۔
تمہارے اور میرے درمیان سنگ و آہن کا ایک مضبوط قانون حائل ہے ایک
سرد ہاتھ نے میرے گلے سے تمہاری ننھی ننھی بانہوں کے ہار نوچ نوچ کر پھینک
دیئے ہیں ۔ مجھے دکھ ہے کہ میں تمہارے لئے چاکلیٹ لینے نکلا ۔ اور
تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر دیئے ۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ۔
نہ روؤ میرے بچو ۔ ہاں آئے گا ' وہ دن ضرور آئے گا جب کوئی بچہ
اپنے ماں باپ سے زبردستی جدا نہ کیا جائے گا ــــــ کسی عورت کے سہاگ
کی افشاں زبردستی نہ اجاڑی جائے گی ۔ آج تمہارے گالوں پر آنسو بہہ
رہے ہیں مگر تمہیں کل معلوم ہوگا کہ یہ شبنم کے قطرے تمہارے گالوں کو
زیادہ نکھار اور زیادہ درخشندگی بخشنے کے لئے بہہ نکلے تھے ۔

میں اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے ایک نسوانی آواز سے چونک
پڑا ۔

فاطمہ آئی تھی ؟
نہیں کوئی دوسری فاطمہ تھی ــــــ ایک ماں !

جو اپنے بچھڑے بچے کو گلے سے لگا کر رو رہی تھی ۔
میرا بچہ ! آج میں دوپہر سے تیرے لئے کتنا ہلکان ہو رہی تھی
میرے لال ! تیری صورت کتنی اتر گئی ــــــ میرے چاند ....

ایک اور ادھیڑ عمر کا آدمی دوسرے گمشدہ بچے کو سینے سے چمٹائے
بے اختیار اس کا منہ چومے جا رہا تھا ۔ بچے کی آوازیں میرے دل پر ہتھوڑے
لگا رہی تھیں ۔

" ابا ۔ ابا ۔ ابا ! "

شام کے چھ بجے تک سارے بچھڑے بچے اپنی ماؤں کی آغوش
میں پہنچ چکے تھے ۔ اپنے باپوں کی گودیوں میں ہمک رہے تھے ۔ لاک
اپ میں اندھیرا بڑھ رہا تھا اور میں تہی آغوش دل گرفتہ اور اداس
مستقبل کا بھیانک چہرہ دیکھ رہا تھا جو آہنی سلاخوں سے جھانک جھانک
کر میرا منہ چڑا رہا تھا ۔

سات بج رہے تھے ۔ لاک اپ میں اندھیرا تھا اور باہر برآمدے
میں روشنی ۔ ایک بجلی کے قمقمے کی مدھم سی روشنی سلاخوں کے اندر آ رہی
تھی ۔ اندھیرے کے ساتھ اجالا بھی قید تھا ۔ قاتلوں ، چوروں ، ڈاکوؤں ،
گرہ کٹوں اور بدمعاشوں کے ساتھ ایک شریف اور مفلس فنکار بھی قید
تھا ۔ میں دروازے میں آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا ۔ کیوں کہ اس گرگ باراں

دیدہ سی۔آئی۔ڈی۔ انسپکٹر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ چھ بجے تک آئے گا۔ اور مجھے اپنی بیوی بچوں سے آخری ملاقات کرانے لے جائے گا! پھر آٹھ بج گئے۔ نو بج گئے۔

حوالات کے قیدیوں کے لئے قریب کے ہوٹل سے کھانا آیا۔ مگر میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ پہلے تو بابا نے مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، بعد میں فحش گالیوں پر اتر آیا۔ ایسی ایسی گندی اور گھناؤنی گالیاں جو میں نے کبھی زندگی میں نہ سنی تھیں۔ اپنی بے چارگی اور بے بسی پر دل بھر آیا۔ آنکھ بھر آئی۔ اندھیری زندگی کے اندھیرے آسمان پر میرے آنسو ستاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اور ٹوٹ رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد سارے غنڈے بالکل ایسے ہی اطمینان کے ساتھ جیسے وہ ان کا گھر ہے، پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔ اب لاک اپ میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ کم از کم لیٹ سکوں۔ ناچار نیم دراز حالت میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ رات کیسے گزرے گی؟ زندگی کیسے گزرے گی؟

اندھیرا، مغلظات، فحاشی، گندگی، بدتمیزی اور لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے ایک فرسودہ نظام میں گرفتار، میں سوچ رہا تھا کہ یسوع مسیح کو بار بار صلیب پر نہیں لٹکایا جا سکتا۔ جھوٹ کے سکوں کا دنیا کے بازار میں ایک نہ ایک دن وہی حشر ہو گا۔ جو نئے ایشیا کے بازاروں میں

ابھی ڈالروں کا ہو رہا ہے۔ آسمانوں پر رہنے والی حق و انصاف کی طاقت ضرور کسی دن زمین پر اتر آئے گی۔ اور کوئی ابراہیم جلیس سچ بولنے کے جرم میں زنداں کی تاریک کوٹھڑی میں نہیں دھکیلا جائے گا۔ نمرود کی آگ گلزار بننے کے لئے ہی جلائی جاتی ہے اور میرا نام بھی ابراہیم ہے:

غنڈے خراٹے لے رہے تھے۔ کافی سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی پاس کے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی ٹرنگ ٹرنگ ٹرنگ پکارنے لگتی تھی ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ جیسے کوئی دور سسکیاں بھر بھر کر رو رہا ہو ——— وہ ضرور سسکیاں بھر بھر کر رو رہی ہو گی۔ بے چاری، وہ جانتی تھی کہ میں روز شام کے سات آٹھ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا اب گیارہ بج رہے ہیں۔ وہ یقیناً پریشان ہو گئی ہو گی۔ جاگ رہی ہو گی۔ میرے قدموں کی چاپ پر آنکھیں لگائے بیٹھی ہو گی۔ بند دروازے کو تک رہی ہو گی ——— مگر یہ دروازہ اب نہ معلوم کب کھلے گا۔ اس نظام حیات میں ایک غریب پر ہر جگہ زندگی کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ کوئی انوکھا المیہ نہیں۔ علی بابا عرصہ ہوا اسم سم کا طلسم بھول چکا ہے!

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے میری ٹانگوں، کمر اور پیٹھ میں درد سا محسوس ہونے لگا۔ کچھ دکھائی نہیں

دے رہا تھا۔ چند مانوس سے چہرے یکے بعد دیگرے سامنے آئے ـــــ

"پیاری پیاری صورتو! موہ بھری مورتو! ملنے سے مجبور ہیں" احساسات میں سہگل کی آواز تیر رہی تھی۔ گونج رہی تھی۔

آج کی رات بھاری ہے۔ آج کی رات قیامت کی رات ہے۔

مستقبل ایک سوالیہ نشان کی شکل میں سامنے پھیلے ہوئے اندھیرے میں ایک دیوانے رقاص ایک شرابی ڈانسر کی طرح ناچ رہا تھا، ناچتا ہی چلا جاتا تھا۔ کیا ہوگا؟ ـــــ کیا ہوگا ـــــ؟ امیدوں کے بہت سے جگنو اُڑ رہے تھے۔ جگنو کی روشنی اندھیرے کو خوبصورت تو بنا دیتی ہے۔ مگر اندھیرا دُور نہیں کر سکتی۔

میں نے کتنے ہی جگنو پکڑے اور چھوڑ دیئے!!

نظریں بھیانک اندھیرے کے باوجود بہت دُور تک دیکھ رہی تھیں۔ بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ فاطمہ ابھی تک جاگ رہی تھی سوچ رہی تھی۔ آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ افسران جن کے حکم سے میں اپنے خاندان سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ چین اور آرام سے اپنے نرم و گداز بستروں پر سو رہے تھے وہ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر جو مجھے اپنی بیوی اور بچوں سے آخری بار ملانے کا جھوٹا وعدہ کر کے گیا تھا وہ بھی اپنی بیوی کی آغوش میں سو رہا ہو گا اور شاید کہ ابھی وہ مجھے خواب میں دیکھ کر گھبرا اُٹھے گا۔ اور اپنی بیوی

کو ٹٹول کر، چھو کر دیکھے گا کہ کہیں وہ بھی بچھڑ تو نہیں گئی ـــــ!
اور وہ میری طرف ـــــ ایسی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے گا جیسے میں ہملٹ کے باپ کی روح ہوں۔ جو ہر دور ہر زمانے میں آتی ہے اور آتی رہے گی!

صبح ہو گئی۔ غنڈے پھر جاگ اٹھے۔ سپاہی جاگ اٹھے مغلظات فحاشی اور گندگی کا سارا نظام پھر جاگ اُٹھا۔ منہ کا مزا بے حد خراب ہو گیا تھا۔ دانت میلے تھے۔ نہانے دھونے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کوئی نو بجے پھر ناشتہ آیا۔ میں نے پھر احتجاجاً انکار کر دیا ـــــ مجھے بھوکا رہتے ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ سر میں بے حد درد ہونے لگا تھا۔ اور لاک اَپ کی بدبو کے باعث تو سر پھٹنے لگا ـــــ کیونکہ غنڈوں نے لاک اَپ کے بیت الخلاء کو بے حد غلیظ کر دیا تھا۔ تعفن کی ناقابلِ برداشت لپٹیں آ رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس تھانے میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کی لاش کئی دن سے سڑ رہی ہے!

کوئی دو بجے تک گھٹنوں میں سر دیئے اونگھتا رہا۔ دو بجے کے قریب لاک اَپ کا دروازہ کھلا اور کوئی تین عدد سی۔ آئی۔ ڈی۔ انسپکٹر صاحبان تشریف لائے۔ وہ غالباً کرسچین معلوم ہوتے تھے۔ البتہ ایک انسپکٹر جو جناح کیپ، کوٹ اور شلوار میں ملبوس تھا بے حد شریف آدمی معلوم ہوتا تھا

وہ مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آیا بنگلے کا ایک سگریٹ پیش کیا۔ اور کچھ ہمدردی کی باتیں بھی کیں۔

اس کے بعد مجھے ایک ٹرک میں بٹھا دیا گیا اور ٹرک سڑکوں پر گھومتی سنٹرل جیل کراچی کے دروازے پر پہنچ گئی۔

جیل کے آہنی پھاٹک نے اپنی دونوں بانہیں میری طرف پھیلا دیں اور میں اس کی آغوش میں۔ بیوی بچوں اور دوستوں کی نظروں سے جیسے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔

(۲)

جیل کی آہنی بانہوں میں اور اس کی سنگین آغوش میں پیار کے گداز اور محبت کی ملائمت کے سوا سب کچھ تھا جس سے زندگی مرجھاتی ہے اور حیات پژمردہ ہو جاتی ہے ——— دو آہنی پھاٹکوں کے درمیان جن کے ایک طرف کراچی ہے اور دوسری طرف جیل۔

گیٹ جیلر مسٹر حمید الحسن میرے کوٹ اور پتلون کی تلاشی لے رہا تھا اس وقت میری جیب میں سوائے کیپسٹن کی ایک ڈبیا جس میں چار سگریٹ تھے اور ایک ماچس کے بکس کے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن وہ چاروں سگریٹ اور ماچس کا بکس بھی لے لیا گیا۔ اور مجھے بتایا گیا کہ جیل کے اندر سگریٹ پینا سخت منع ہے۔ میں سمجھ گیا۔

"مگر مجھے تو سگریٹ کی شدید طلب ہے۔ میری زندگی کے اندھیرے میں
اگر کوئی اجالا ہے تو یہ سگریٹ کے ننھے سے شعلے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ...
..... اور میں تو ایک سیاسی قیدی ہوں۔"

لیکن وہاں سارے وردی پوش تھے۔ سارے پولیس کے سپاہی تھے
ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ میں ابراہیم جلیس ہوں۔ اس لئے شنوائی
نہیں ہوئی۔ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر صاحبان نے وارنٹ جیلر مسٹر کرم حسین کے
حوالے کر دیئے۔ اور مسٹر کرم حسین نے مجھے ایک سینئر قیدی حنیف کے حوالے
کر دیا۔ حنیف "مہاڑی" (یہ جیل کے دفتر کا نام ہے) میں کام کرتا تھا اس کا
یہ کام بھی تھا کہ نو وارد قیدیوں کو اندر ان کی "منزلِ مقصود" پر پہنچا دے۔

اندرونی پھاٹک کا بغلی دروازہ کھلا۔ اور میں حنیف کے ساتھ اندر
داخل ہوا۔ سامنے ایک باورچی خانہ تھا۔ جس پر "بی کلاس کچن" لکھا ہوا تھا۔
جیل سے باہر میں یہ سنا کرتا تھا کہ سیاسی قیدیوں کو الگ کمرے میں رکھا
جاتا ہے انہیں سونے کے لئے چارپائی، بستر، بیٹھنے کے لئے کرسی اور پڑھنے
کے لئے کتابیں اور اخبار ملتے ہیں۔ اس لئے حنیف پر اپنے سیاسی قیدی
ہونے کے رعب کو مسلط کرنے کی کمینہ خواہش کے زیر اثر میں نے اس سے
پوچھا ——— "میرا کمرہ کدھر ہے ———؟"

حنیف مسکرانے لگا اور بولا۔

"کمرہ؟" جناب یہ ساری جیل آپ کی ہے جہاں جی چاہے رہیئے۔"

اس کے بعد حنیف نے مجھے بتایا کہ سیاسی قیدی ہو یا اخلاقی قیدی۔ سب
کو پہلے "چکر" میں رکھا جاتا ہے۔ چکر جیل کے بیچوں بیچ دیواروں کا ایک گول
دائرہ ہوتا ہے۔ جس کے اندر چار بارکیں ہوتے ہیں۔ یعنی جو شخص پہلے قسمت
کے چکر میں پھنستا ہے۔ وہ پھر جیل کے "چکر" میں رکھا جاتا ہے۔ حنیف نے
مجھے جیل کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ حنیف ایک پچیس چھبیس سالہ
نوجوان لڑکا ہے۔ انٹرنس تک تعلیم پا چکا ہے۔ کسی دفتر میں ملازم تھا چیٹنگ
یا فریب دہی کے الزام میں دو سال قید بامشقت کی سزا لے کر اندر آیا ہے۔
گفتگو اور چہرے مہرے سے وہ ایک شریف خاندان کا لڑکا معلوم ہوتا تھا اس
نے کہا۔ "میں نے چیٹنگ ویٹنگ کچھ نہیں کی۔ محض شبہ میں پکڑا گیا ہوں۔"

اور پھر بے حد اداس ہو کر افسردہ لہجے اور آزردہ آواز میں اس نے کہا۔
میں آپ کو جانتا ہوں۔ میں نے آپ کے افسانوں کی ساری کتابیں پڑھی ہیں
آپ کا قلم سچائی اور صداقت کا سرچشمہ ہے اور اس دنیا میں صداقت اور سچائی
صرف لغت کے الفاظ ہیں۔ خیر برا ہوا کہ آپ اندر آگئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ
اچھا بھی ہوا کہ آپ آگئے۔ کیونکہ یہاں کے تیرہ سو انسان بھی آپ کی توجہ
اور ہمدردی کے مستحق ہیں ——— آپ دیکھیں گے کہ اس جیل میں بیشتر قیدی
انسان بے گناہ ہیں۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم چکر میں داخل ہو گئے۔ چکر کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے۔ جس کے بیچوں بیچ برگد کے ایک درخت کی گھنی چھاؤں میں کرسی پر ایک جمعدار بیٹھا تھا۔ جس کا نام جیل کی اطلاع میں "چکر جمعدار" ہے حنیف نے چکر جمعدار کو میرے "داخلے" کے متعلق بتایا اور چکر جمعدار نے حنیف سے کہا۔

"اس کو بارک نمبر ا سیفٹی لائن میں لے جاؤ۔"

بارک نمبر ایک کا پھاٹک کھلا اور میں اندر داخل ہوا۔ ایک لمبا سا بیرک تھا جس کے برانڈے میں خوفناک شکلوں والے قیدی بیٹھے تھے۔ جنہوں نے مجھے دیکھ کر بیک آواز نعرہ لگایا۔

"اوئے سیفٹی ——"

اس نعرے نے مجھے سر سے پاؤں تک لرزا دیا۔ ایک بار پھر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان غنڈوں کے درمیان چھوڑ کر حنیف نے کہا۔

"اچھا! اب میں چلتا ہوں۔ کبھی کبھی اِدھر آپ سے ملنے آتا رہوں گا!"

غنڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا —— اور —— وہی سوالات —— ؟

کاہے میں پکڑا گیا؟ کیوں پکڑا گیا؟ کب پکڑا گیا ——؟ کب تک رہے گا؟

میں ان صورتوں اور ان کے سوالات سے گھبرا گیا تھا

اچانک میری نظر مسٹر احمد علوی صدر پاکستان کلارک ایسوسی ایشن پر پڑی۔ جو برانڈے کی ایک کمان میں لیٹے ہوئے تھے۔ وہ بھی دوڑتے ہوئے آئے اور میرے گلے سے لپٹ گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چلو ایک تو شریف آدمی مل گیا۔ جس سے بات چیت کی جا سکتی ہے۔ احمد علوی مجھ سے دس بارہ دن پہلے گرفتار ہوئے تھے اور انہیں دس بارہ دنوں میں جیل کی زندگی کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان کے تجربات میرے لئے اس عجیب و غریب سنگلاخ اور آہنی زندگی میں کافی نرمیاں پیدا کریں گے۔ احمد علوی نے دوسرے سیفٹی قیدیوں کا مجھ سے تعارف کرانا شروع کیا۔

(۱) ان سے ملو۔ یہ کراچی کے مشہور دادا ہیں۔ کراچی کے سارے بدمعاش ان کا لوہا مانتے ہیں۔ پک پاکٹ میں بمبئی اور کلکتہ تک شہرت رکھتے ہیں۔ مسٹر بی۔ ایل۔ بابل۔ لیکن جیل میں سب لوگ انہیں "ببری" کہہ کر پکارتے ہیں۔

بابل یا ببری سیاہ فام حبشی نژاد قوی ہیکل سرخ آنکھوں ــــ اور گھنگھریالے بالوں والا ایک دیو تھا۔

(۲) یہ محمد مکرانی —— یہ بھی کافی شہرت یافتہ شخصیت ہیں۔ مار پیٹ اور جھگڑا کرنے میں ماہر ہیں۔ ان پر تین مختلف مقدمے چل رہے ہیں —— اور فی الحال انہیں سیفٹی ایکٹ میں پکڑا گیا ہے۔

محمد مکرانی بھی ایک طویل القامت گٹھیلے مضبوط جسم اور لمبے لمبے بالوں والا وجیہہ انسان تھا۔ صورت شکل اور جسامت سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دل بہار لسی کا وہ اشتہار جو صدر میں "پرشین کیفے" کے سامنے ٹیکسی کے اڈے کے پاس لگا ہوا ہے۔

(۳) یہ سردار کرم داد ہیں۔ جنہوں نے میونسپل کارپوریشن کے بھنگیوں کے حقوق کی خاطر بھوک ہڑتال کی تھی۔

سردار کرم داد دبلا پتلا، سیاہ رنگ، اور گھٹے ہوئے سر کا کرسچین تھا۔ جو کرسچیانیٹی اور انگریزی زبان کے سوا سب کچھ جانتا تھا۔ اور بقول اس کے یہ کوئی مشخری کی بات نہیں تھی (یعنی مسخرے پن کی بات نہیں تھی)

(۴) خلیل ــــ یہ بھی سیفٹی ایکٹ میں پکڑا گیا تھا۔ غالباً جھگڑا یا چرس فروشی، یا پھر جیب تراشی میں ادھوری مہارت رکھتا تھا، اور شاید اسی لئے پکڑا بھی گیا۔

(۵) علی محمد مکرانی ــــ یہ متوسط قد اور مضبوط جسم کا مکرانی تھا۔ ج
سینما کے ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹ کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ ا
نے ایک بہت بڑے افسر کی بیٹی کو فلم "شبنم" کا تین روپے والا ٹکٹ دس روپے میں فروخت کیا تھا۔ وہ بے چاری تو خیر فلم دیکھنے لگی لیکن اس نے جیل بھ

(۶) ابراہیم ــــ میرا ہم نام ــــ لوگوں کو فریب دینے، مختلف قسم ک

کی بدمعاشی اور جانے کیا کیا کچھ ــــ اور پھر سیفٹی ایکٹ؟

(۷) شیرو ــــ شیرو کیا تھا اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہ اس کے نام سے ظاہر ہے میرا جہاں تک خیال ہے۔ پبلک سیفٹی ایکٹ کا اس پر اسی لئے اطلاق ہوا کہ اس کا نام شیرو ہے۔

(۸) یٰسین۔ آپ نے اگر فلم "بغداد کا چور" دیکھا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ نے یٰسین کو بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ یٰسین کی چھوٹی سی داڑھی، نوکدار مونچھیں، سر پہ رومال بندھا ہوا جسم پر گیرو لے رنگ کا ایک قمیض۔ اور ایک سیاہ رنگ کا تہمد۔ یہ بھی سیفٹی ایکٹ کا شکار تھا۔ مگر اس کی فرد جرم سے کوئی واقف نہیں تھا کیونکہ دوسرے سارے سیفٹی قیدیوں سے اس کی لڑائی تھی اور بات بند تھی۔ یہ بے حد دلچسپ شخصیت تھی۔ سب قیدی اسے دیکھتے ہی چٹکی بجا کر اسے چھیڑا کرتے تھے۔ اور انہیں نہایت فحش مغلظ اور گندی گالیاں دیتا۔ جب گالیاں دیتے دیتے تھک جاتا تو یا علی یا علی چیخ چیخ کر اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگتا ــــ محمد مکرانی قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے کہتا۔

"سالا چریا (پاگل) ہو گیا ہے یٰسین۔ وڑی دیکھو نا؟ ہم اس کو بولا، تم چڑتا کیوں ہے۔ تم وڑی چڑتا ہے تو لوگ چڑاتا ہے۔ وڑی چڑنا چھوڑ دے تو ہم کو کتا کاٹا ہے کہ ہم تم کو چڑائے؟ ــــ

قوقوقو ____ قوقوقو ....

ٹرٹ ٹرٹ پھر ____ ؟ کسی نے پھرکی بجائی اور پلیین کے منہ سے
مغلظات کا لاوا پھوٹ پڑا۔ شدتِ غم کے باوجود میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا!

میرے ان ساتھیوں نے جب احمد علوی کی زبانی میری تعریف سُنی
تو میری بڑی آؤ بھگت کی۔ علی محمد نے فوراً ایک کمبل بچھایا اور مجھے بیٹھنے کے
لئے کہا۔ میں نے کہا۔

"میں نے کل سے آج تک منہ نہیں دھویا ہے میں ذرا ہاتھ منہ دھولوں!"
میں اٹھنا چاہتا تھا کہ محمد مکرانی نے کہا۔

"مانی باپ، تم وری ادھر بیٹھو ہم تمہارے لئے پانی لائے گا۔"

وہ فوراً مٹی کے ایک لوٹے میں پانی اور فارہنس ٹوتھ پیسٹ کا آدھا
ٹیوب لے آیا۔ میں نے انگلی پر پیسٹ لگا کر بڑی دیر تک دانت صاف کئے
منہ دھویا۔ لیکن آنکھیں بے خوابی کے باعث کافی سوج گئی تھیں اسی اثناء
میں ایک اور قیدی آیا۔ سب قیدی بڑے اشتیاق سے کہنے لگے۔

"رمضان آگیا ____ رمضان آگیا!"

رمضان قیدی "کراچی جیل کا "کے ایل سہگل" ہے۔ بہت اچھا گاتا ہے
جیل خانے کی تلخ اور تکلیف دہ زندگی میں اس کے گیت صحرا کے چشموں
کا کام دیتے ہیں۔

سب قیدی اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ رمضان سے میرا بھی
تعارف کرایا گیا۔ اور میرے اعزاز میں نئے ساتھیوں نے رمضان کو گانے
پر مجبور کیا۔ شیرو مٹی کا خالی گھڑا لے آیا جسے طبلہ کے نعم البدل کے طور پر
استعمال کیا گیا۔ اور رمضان دھم دھمک دھم دھوک کے ساتھ گانے لگا۔

انہیں کیا خبر کہ کوئی برباد ہے
میرے دل کی دنیا تو ناشاد ہے

رمضان کی آواز میں کافی سوز اور مٹھاس تھی اور طرز، عام پسند
کے فلمی گانوں جیسی ____

میرا دل بے قرار کچھ بہنے لگا۔ اس کا گیت، جیسے میرے دل کے بچے
کو دھیرے دھیرے تھپک رہا تھا۔ اسی گیت میں ایک حسبِ حال شعر آیا۔
جو یہ تھا ____ ارے بھولے دل تو کہاں آگیا ہے
جہاں داد ہے اور نہ فریاد ہے

تو نہ صرف سارے قیدی پھڑک کر واہ واہ کرنے لگے بلکہ میری
آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک آئے۔ یہ اتنی شدید سچائی تھی کہ میں اسے
آنسوؤں کا نذرانہ ہی پیش کر سکتا تھا۔ مجھے روتا دیکھ کر بی۔ ایل۔ بابل المعروف
بربری کو شاید غصہ آگیا۔ اور وہ بولا۔

"لے بے محمد! یہ بابو تو روتا ہے۔ ہش۔ ارے مرد کے بچے کہیں روتے

ہیں۔ تو اتنا پڑھا لکھا آدمی۔ ہم جاہل تجھ سے اچھے ہیں۔ ارے بابو یہ جیل تو کچھ بھی نہیں۔ اب تو یہ جیل نہیں چکلہ ہے۔ ہاں کسی زمانے میں یہ جیل تھی جب ہم چکی پیستے تھے اور چوبیس گھنٹے میں کسی نہ کسی سپاہی کا ڈنڈا ہمارے جسم پر ٹوٹ جاتا تھا۔ اب سوائے جھاڑو دینے اور زمین پر لیٹنے کے کوئی کام بھی نہیں"۔

محمد مکرانی نے جواب دیا۔

"وری تو فکر نہ کر بری! ہم بابو کو آج ہی ٹھیک کر دے گا۔ لے بابو سگریٹ پیے گا؟"

میں سگریٹ کیلئے بڑی دیر سے ترس رہا تھا۔ جب محمد نے مجھے برکلے کا ایک سگریٹ پیش کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ مجھے کوئی گراں قدر اور انمول تحفہ پیش کر رہا ہو۔ میں نے برکلے کے دو تین کش لئے۔ لیکن اس کا کچھ عجیب سا مزا تھا۔ میں نے بارہا برکلے پیا ہے مگر اس میں کچھ مٹھاس تھی اور گلے میں کچھ کچھ تلخی سی محسوس ہوتی تھی۔ تین چار کش کے بعد مجھے سگریٹ دوسرے کو دینا پڑتی۔ کیونکہ جیل میں پورا ہو یا آدھا حقے کی طرح پیا جاتا ہے سگریٹ جب پورے حلقے کا چکر کاٹ کر میرے واپس واپس آیا تو دھوئیں سے اس کی سفید رنگت سرمئی ہو گئی تھی۔ اس میں ایک کش بھی زندگی باقی نہ تھی اور میں نے ایک کش میں وہ بھی چھین لی۔ اس کے بعد مجھ پر کچھ ایسی

غنودگی چھا گئی کہ میں وہیں سب سے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ دو تین گھنٹے تک بالکل بے ہوش اور بے سدھ پڑا رہا۔ چار بجے کے قریب جب دھوپ کی وجہ سے علوی نے مجھے بتایا تو میرے سارے نئے ساتھی ہنس رہے تھے اور مجھے علوی نے بتایا کہ۔

اس سگریٹ میں چرس ملی ہوئی تھی!

اور محمد مکرانی بری کی طرف ایسی معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کیوں بری۔ آخر آج ہی ٹھیک کر دیا نا بابو کو ——— اور میں ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ ایک "پرانے چرسی" کی طرح سوچ رہا تھا کہ پبلک سیفٹی اور چرس میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ خواص میں، مزے میں، نشے میں دونوں میں حیرت ناک حد تک مشابہت تھی۔ چرس اگر انسان کو تھوڑی دیر کے لئے مدہوش اور بے سُدھ کر سکتی ہے تو پبلک سیفٹی ایکٹ ایک لمبے عرصے کے لئے اچھے خاصے انسان کو مجبور اور مفلوج کر دیتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ چرس غریب آدمی استعمال کرتے ہیں اور پبلک سیفٹی ایکٹ بڑے آدمی لیکن دونوں کے بُرے اثرات صرف غریب آدمی بھگتتے ہیں۔

اسی اثنا میں ایک آواز آئی۔

"چلو لے سیفٹی!"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تین قیدی سروں پر بڑے بڑے دیگچے اٹھائے

آئے معلوم ہوا کہ بھتہ آیا ہے۔ مجھے مٹی کا ایک پیالہ (جسے جیل کی اصطلاح میں
جمینی کہتے ہیں) دیا گیا اور ہم سب سیفٹی قیدی دیوار سے ایک لائن بنا کر بیٹھ
گئے۔ بھتہ بانٹنے والے قیدیوں نے ہر ایک کی جمینی میں پانی کی طرح پتلی پتلی
دال ڈالنی شروع کی۔ اور ہاتھ میں دو دو چپاتیاں اور تھوڑا سا چاول تھما
دیا۔ مجھ سے چار لقمے بھی نہیں کھائے گئے۔ میں نے اپنا بھتہ وہیں رکھ دیا۔
دو تین سی کلاس قیدی جنہیں سیفٹی قیدیوں کی طرح کھانا نہیں ملتا تھا۔ بڑی
للچائی ہوئی نظروں سے میرے بچائے ہوئے کھانے کو دیکھنے لگے میں نے اپنا
کھانا انہیں دے دیا تو وہ اس پر جھپٹ پڑے اور دو تین منٹ
سارا کھانا صاف کر دیا اور زبان سے جمینی کو چاٹنے لگے۔ مجھے انسان کی بے
چارگی اور بے بسی پر بڑا ترس آیا۔ مجھے سی کلاس کا ہر قیدی یوں معلوم ہوتا تھا۔
جیسے کسی قحط زدہ علاقے سے آیا ہو جیسے کسی بنگال کا باشندہ ہو۔ جیسے
ہندوستانی تاریخ کا ۱۹۴۳ء ہو۔

کھانا کھانے کے بعد سگریٹ کی "پیاس" پھر شدت سے محسوس
لگی مگر سگریٹ کسی کے پاس بھی نہیں تھی۔ اسی اثنا میں ایک مقدم (یہ بھی
قیدی ہوتا ہے۔ اس کی سزا کی میعاد لمبی ہوتی ہے۔ اس کو ایک پیلی شلوار
پیلی ٹوپی دی جاتی ہے) آیا اور اس نے کہا۔

"آؤ رے، اپنے اپنے کمبل لے لو۔"

میں احمد علوی کے ساتھ گیا۔ مقدم نے، جس کا نام دُرجان بلوچی تھا۔
مجھے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا اور دو کمبل دیئے۔ جن پر سفیدے سے "کے۔ ڈی۔
پی" لکھا ہوا تھا۔ ان کمبلوں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں روئیں کم تھیں
اور جوئیں زیادہ۔ جب ہم اپنے کمبل لے کر آئے اس وقت شاید ساڑھے چار
بج رہے تھے اور ایک سپاہی چابیوں کا ایک لمبا گچھا جھنجھناتا ہوا آیا اور
آواز لگائی۔

چلو رے چلو، اپنی اپنی "کھولی" پکڑو۔

کھولی جیل کی اصطلاح میں کوٹھڑی کو کہتے ہیں اور مجھے معلوم ہوا کہ
ہر روز شام کو ساڑھے چار بجے کھولیوں میں بند کر دیا جاتا ہے اور صبح چھ بجے
کھول دیا جاتا ہے۔

میں احمد علوی اور سردار کرم داد کھولی نمبر ۲۷ میں بند کر دیئے گئے
اس کھولی کے کونے میں چکی کا چبوترہ تھا اور دوسرے کونے میں ایک مٹی
کی صحنک رفع حاجت کی غرض سے رکھی گئی تھی۔ کھولی ویسے تو صاف ستھری
تھی مگر ہمارے ساتھی سردار کرم داد نے صحنک میں پیشاب کر کے تھوڑا سا
تعفن کھولی کی فضا میں گھول دیا تھا۔ جیسے ہی سپاہی نے کھولی کے آہنی
سلاخوں والے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا احساسِ قید میں زیادہ شدت
پیدا ہو گئی۔ دل گھبرانے لگا۔ میں روزانہ شہر کی پُر رونق سڑکوں اور جگمگاتی

ریسٹورانوں میں رات گئے تک گھومنے پھرنے والا آزاد منش انسان زندگی کی
اتنی تنگ بھنچی ہوئی، پتھریلی اور آہنی آغوش میں ـــــــ گھٹن
نے میرے قلب میں اختلاج پیدا کر دیا۔ سارے قیدی کھولیوں میں بند
کئے جا چکے تھے۔ وارڈ میں سپاہیوں کے جوتوں کی کھٹ کھٹ یوں
ہی سنائی دے رہی تھی۔ جیسے اندھیرا قہقہے مارتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے
ہیں اور علوی وقت کو کاٹنے کے لئے مختلف قسم کی مختلف باتوں کے کُند
ہتھیار استعمال کرتے رہے۔ وقت ایک زخمی سانپ کی طرح رینگ رہا
تھا۔ اب ہماری باتیں کچھ بجھی بجھی سی ہو گئی تھیں۔ مثلاً

باہر سورج غروب ہو گیا ہوگا!

شفق کی لالی کے لئے جانے کتنی گل رنگ عورتوں کا جمال مستعار لیا
گیا ہوگا۔ صدر کے چوراہے پر سارے دوست جمع ہوں گے۔ ہماری کمی
محسوس کر رہے ہوں گے پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں بھول کر کسی مزیدار بات
پر قہقہے لگاتے ہوئے کسی ریستوران میں چائے پی رہے ہوں گے۔ مگر ابھی ابھی
تو سپاہی نے مجھ پر اور ان دونوں پر دروازے مقفل کر دیئے تھے۔ اندھیرا
بھی رینگتے رینگتے ہماری کھولی میں آ گیا تھا۔ اب علوی اور سردار اکرم داد
بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ پسّو اور کھٹمل بُری طرح کاٹ رہے تھے
مچھر چہرے کے اطراف گھن گھن کر رہے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا اور

گھنا ہوتا تھا۔ جیسے دنیا کے سارے چراغ ساری قندیلیں، ساری شمعیں اور
سارے قمقمے بجھا دیئے گئے ہوں۔ جیسے چاند پورے کا پورا گہنا گیا ہو۔ جیسے
سارے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر چکے ہوں۔

رات اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے اس گہرے اندھیرے میں کبھی
کبھی کوئی سپاہی لالٹین لئے ہماری کھولی کے سامنے سے گزرتا تو ہمیں یوں
محسوس ہوتا جیسے یہ اجالا کوئی چھوٹا سا چمکیلا خواب ہے جسے اُجالے کی کرنوں نے
ابھی ابھی بنایا اور ابھی ابھی توڑ دیا۔ یہ چھوٹا اور مختصر اجالا جو ایک سپاہی
کی لالٹین سے پھوٹتا تھا جو ایک سرمایہ دارانہ جمہوریت کے چراغ کی لَو پر
کانپ رہا تھا اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے اندھیرے کو اور زیادہ کالا اور زیادہ
بھیانک بنا دیا تھا۔

کھٹملوں کی جوئیں سر کے بالوں پر پہنچ گئی تھیں۔ سر بہت کھجانے لگا تھا
جب میں نے احمد علوی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے نہایت ہی مزیدار
جواب دیا کہ

"ایسا تو ہوتا ہی ہے اس سماج میں ہر غریب آدمی سر کھجاتے کھجاتے ہی
زندگی گذارتا ہے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ لیکن میں نے آدھی ہنسی روک لی۔ ہنسنا مجھے ایک بہت
بڑا جرم معلوم ہو رہا تھا۔ جب کہ میری بیوی اور بچے بے آسرا اور بے سہارا ایک

نئے اجنبی ملک میں شدید پریشانی میں مبتلا تھے۔ علوی نے کہا۔

جیل میں دن تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتا ہے۔ مگر رات گزرنے میں نہیں آتی۔ میں تو رات رات بھر جاگتا ہوں۔

میرا دل کہنے لگا۔ ہاں ہم عرصے سے جاگ رہے ہیں اور اس لئے جاگ رہے ہیں کہ پھر کہیں کوئی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ہماری زندگی میں طلوع نہ ہو۔ کیونکہ پچھلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب آزادی کی صبح آئی ہم رات بھر کے جاگے ہوئے غریب آدمی اطمینان سے سو گئے تھے اور ۱۵ اگست کا ہمارا دن جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے ہم سے چھین لیا تھا اور ہمارے آگے وہی پرانا اندھیرا پھینک دیا تھا جسے انگریزی سامراج نے ہماری ترقی کے راستے پر سیاہ چٹان کی طرح رکھ دیا تھا۔

کھولی میں بھی اندھیرا تھا۔ بیرونی سامراج اور دیسی سرمایہ داروں کی سازشوں، ٹوٹوں اور ٹوٹکوں سے بنایا ہوا اندھیرا جو ان گنت غریب آدمیوں کے گھروں اور زندگیوں کے چراغ بجھا بجھا کر پیدا کیا گیا تھا اور اس اندھیرے کے دبیز پردے نے ایک باپ سے اس کے پانچ بچے اور ایک شوہر سے اس کی بیوی کو جدا کر دیا تھا۔ اس اندھیرے میں ہزاروں محبتیں سسک سسک کر رو رہی تھیں۔ اور ان گنت آنسو بغیر چمکے ہی ٹوٹ رہے تھے۔

رات بھر اس اندھیرے میں فاطمہ کے جسم کا چمکیلا ہیولیٰ بکھری ہوئی

پریشان زلفوں اور بے قرار پھیلی ہوئی باہوں کے ساتھ مجھے ڈھونڈتا رہا۔ مگر اتنا اندھیرا تھا کہ وہ میرے گلے میں اپنی باہوں کا ہار نہ پہنا سکی۔ اپنی زلفوں کو میرے شانوں پر نہ بکھیر سکی۔

ہاں ــــ البتہ اس کی آواز اندھیرے میں برابر گونج رہی تھی ــــ تم کہاں ہو ــــ؟

تم میرے قریب کیوں نہیں آتے؟

میں تمہارے پاس کتنے ہزاروں کوس کی مسافت طے کر کے آئی ہوں سطح مرتفع دکن، دریائے کرشنا، تنگھبدرا۔ کوہ بندھیاچل، کوہستان مالابار اور بحر ہند کو عبور کر کے تمہارے پاس آئی ہوں۔ اور پھر تم مجھے چھوڑ گئے۔

میں کب تک تمہیں ڈھونڈتی رہوں۔

کیا مجھے سندھ کا لق و دق صحرا بھی عبور کرنا پڑے گا؟

کیا ساری زندگی میں یوں ہی تمہارا تعاقب کرتی رہوں ؟؟؟

فاطمہ اندھیری سڑک پر، ہر قدم پر محبت کا چراغ جلا کر راستہ دیکھنے کی کوشش کرتی۔ مگر ظلم کی ہواؤں کے تیز جھونکے اس چراغ کو بجھا دیتے فاطمہ کے لئے میرے دل میں رہنا تو بہت آسان تھا مگر اونچی اونچی بلڈنگوں کے شہر کراچی میں رہنا بہت مشکل!

سردار اکرم دادا اور علوی دونوں سو چکے تھے۔ میں دیوار سے پیٹھ

لگائے نیم دراز حالت میں بیٹھا تھا۔ ایک سپاہی لالٹین ہلاتا ہوا کھولی کے سامنے سے گذرا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سائیں اب کیا وقت ہے؟"

اس نے "سائیں" کے خطاب سے خوش ہو کر جواب دیا۔

"ساڑھے تین!"

مجھے ہلکی سی خوشی ہوئی کہ چلو رات ساکت نہیں۔ رات گزر رہی ہے رات گذر جائے گی۔

رات گذر گئی۔

کھولیوں کے تالے کھلنے لگے۔ قیدی کھولیوں سے آزاد ہو کر جیل میں گرفتار ہو گئے۔ ہمارے مقدم نے حکم دیا کہ اپنی اپنی کھولیاں خالی کر دو۔ ہم اپنے اپنے کمبل لپیٹ کر باہر صحن میں آئے اور سارے بستر ایک لائن میں جما دیئے یہ بستروں کی پریڈ تھی معلوم ہوا سپرنٹنڈنٹ جیل راؤنڈ پر آنے والا ہے۔ سارے قیدی جیل کی جھاڑو دینے لگے اور کھولیاں صاف کرنے لگے۔ ہم سے کام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ ہم سیفٹی قیدی تھے۔ پہلے تو مقدم نے میرے ہاتھ میں جھاڑو پکڑا دی۔ مگر جب علوی نے اس سے کہا یہ "سیفٹی" ہے۔ تو پھر اس نے میرے ہاتھ سے جھاڑو لے لی۔ ورنہ پھر افسانہ نگاری سے جاروب کشی تک کی رجعت قہقری زندگی کی بڑی دلچسپ سی یادگار ہوتی۔

میں اور علوی ہاتھ منہ دھونے نلکے پر گئے۔ مگر نلکے پر قیدیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ بعض قیدی تو بالکل مادر زاد ننگے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے نہا رہے تھے۔ ان میں کوئی شرم و حجاب نہ تھا۔ اخلاق کا کوئی احساس نہ تھا۔ یہ لوگ اتنی ترقی یافتہ دنیا میں بھی عہدِ بربریت کے آدمی کی یاد دلاتے تھے جو آدمی ہونے کے علاوہ وہ سب کچھ تھا۔

مگر میں سوچنے لگا کہ آخر مجھ میں اتنا احساسِ برتری کیوں ہے؟ میں کیوں ان بھولے بھالے انسانوں سے نفرت کرتا ہوں۔ میرا رویہ ان کے ساتھ اتنا غیر ہمدردانہ کیوں ہے؟ میں نے سختی کے ساتھ اپنا محاسبہ آپ شروع کر دیا کہ یہ اگر غنڈے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے ــــــ انہوں نے تو اس سماج سے غنڈہ گردی سیکھی ہے۔ زندگی کی شدید مجبوریوں نے انہیں چوری کرنے اور ڈاکے ڈالنے پر مجبور کیا ہے۔ زندگی کے جبر نے انہیں اخلاق اور تہذیب کے قوانین کو توڑنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ میں ان سیدھے سادھے انسانوں سے نفرت کرنے کے بجائے ان چند لوگوں سے کیوں نفرت نہیں کرتا جنہوں نے انسانوں کے روپ میں ان گنت انسانوں سے زندگیاں چھین کر دنیا کے چپے چپے پر اپنا قبضہ کر لیا۔ حالانکہ دنیا کے سب سے بڑے غنڈے تو معدودے چند آدمی ہیں ــ اُن غنڈوں میں اور اِن غنڈوں میں انیس بیس کا بھی تو فرق نہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ زرتار لباس والے غنڈے مجھے

سلیقے سے غنڈہ گردی کرتے ہیں اور جیتھڑوں میں لپٹے ہوئے غنڈوں میں کوئی سلیقہ نہیں ہے۔

ابھی میں نے اپنا محاسبہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے ہر قیدی سے ندامت سی ہونے لگی اور میں احساس برتری کی سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے آگرا تھا جہاں محمد مکرانی بڑے میٹھے لہجے میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"بابو، وردی تو نہاتا کیوں نہیں ہے ــــــ آ، میں تیرے لئے پانی کا ایک گھڑا بھر دوں!"

یہ کہہ کر اس نے ایک خالی گھڑا اٹھایا اور نلکے سے پانی بھر کر ہمارے پاس لاکر رکھ دیا۔ میں نے محمد مکرانی کو غور سے دیکھا۔ کتنا خلوص ہے اس شخص میں۔ کل تک یہ شخص مجھے جانتا بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک دن کے مختصر سے ساتھ نے اسے مجھ سے کتنا قریب کر دیا ہے۔ یہاں جیل میں اس کو مجھ سے کسی فائدہ کی توقع نہیں مگر وہ میری خدمت کئے جا رہا ہے۔ اس کو اور مجھ کو ملانے والا صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ ہے انسانیت!

اس وقت بابل المعروف بہ ببری نے صابن کا ایک ٹکڑا اور وہی فارہنس ٹوتھ پیسٹ کا آدھا ٹیوب ہمیں لاکر دیا۔ بولا۔

"بغیر منجن اور صابن کے کیسے منہ دھوئے گا۔ لے میں تیرے لئے لایا ہوں۔"

میں نے اس ابراہیم جلیس سے پوچھا جو غنڈوں سے نفرت کرتا تھا۔

"بتاؤ تم اسے کیا کہو گے؟ اخلاق؟ خلوص؟ انسانیت؟ ــــــ" وہ ابراہیم جلیس انتہائی معذرت کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو۔ اب میں نے سچے خلوص، سچے اخلاق اور سچی انسانیت کو دیکھ لیا ہے۔ اور دیکھو۔ اب تو میں احساسِ برتری کی سیڑھیوں سے لڑھکتا نیچے زمین پر آگرا ہوں ــــــ اب، تو مجھے معاف کر دو!"

اب وہ ابراہیم جلیس بڑے تجربے کی باتیں بتا رہا تھا۔

"ہر آدمی ماں کے پیٹ سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن سونے چاندی کے بنگلوں اور دکانوں والی سڑکوں پر سے گذرتے ہوئے وہ انسانیت کا راستہ بھول جاتا ہے انسانی آبادیوں کی طرف جانے کی بجائے وہ جانوروں کی چراگاہ کی طرف چلا جاتا ہے۔"

اب دونوں ابراہیم جلیس ایک ہو گئے تھے اور تیرہ سو قیدیوں کے وسیع خاندان میں ایک نئے بھائی کا اضافہ ہو گیا تھا۔

یہاں کوئی ہابیل تھا۔ اور نہ کوئی قابیل۔ یہاں کوئی بنک نہیں تھا کوئی بازار نہیں تھا۔ کسی کو کسی سے جائز یا ناجائز فائدے کی طمع نہیں تھی۔ کوئی کسی کا حاسد نہیں تھا۔ سب قیدی تھے چند سرمایہ داروں کے سماج کے قیدی ــــــ ایک خود مقید زندگی کے قیدی ــــــ!

یہ جیل ـــــ پتھروں اور لوہے کی یہ تنگ جیل. مجھے اس وسیع و
عریض جیل سے اچھی معلوم ہونے لگی. جو سونے کی اینٹوں اور چاندی کی سلاخوں
میں جکڑی ہوئی ہے. جہاں انسان جینے کے لئے ہر روز مرتا رہتا ہے. جہاں
زندہ رہنے کے لئے وہ جھوٹ، دھوکہ، خود غرضی اور حیوانیت کے سہارے
تلاش کرتا ہے. جہاں کوئی محمد مکرانی کسی ابراہیم جلیس سے سیدھے منہ بات
نہیں کرتا. جہاں قدم قدم پر انسان کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے جاتے ہیں. جہاں
انسان چل نہیں رہا ہے. بلکہ پیٹ کے بل رینگ رہا ہے.

میں اپنے آپ کو ڈھارس دینے لگا.

"گھبراؤ نہیں، یہ سنگ و آہن کی قید، سیم و زر کی قید کے مقابلے
میں کم تکلیف دہ اور کم اذیت ناک ہے. مسکراتے کیوں نہیں ـــــ
مسکراؤ!"

لیکن شاید پبلک سیفٹی ایکٹ نے جیل کے باہر ہی مجھ سے میری
مسکراہٹ بھی چھین لی تھی.

(۳)

نہانے کے بعد جب میں اپنی کھولی پر آیا تو ناشتہ آ چکا تھا. عام سی
کلاس قیدیوں کو تو آٹے کنکر میں گندھی ایک ایک روٹی بلکہ ایک ایک
روٹی کی ٹکیہ دی گئی. میں اور علوی چونکہ سیفٹی قیدی تھے اس لئے ہمیں ایک
ایک چپاتی دی گئی جس میں گندم کم اور مٹی کنکر زیادہ تھی. اس کے ساتھ
ایک پاؤ دودھ یا دودھ نما پانی اور ایک چمچ شکر بھی. جسے بصد شکر ہم نے
آنکھیں بند کر کے حلق سے نیچے اتار لیا. معلوم نہیں کہ یہ "من و سلویٰ" ہمارے
پیٹ تک پہنچا بھی یا اوپر ہی اوپر کہیں تحلیل ہو گیا.

اس کے بعد سگریٹ کی بڑی شدید طلب محسوس ہوئی. لیکن ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ میں جیل میں نہیں ہوں بلکہ کسی سکھ دوست کے گھر مہمان

ہوں۔ محمد مکرانی سے ہم دونوں کی بے چارگی دیکھی نہ گئی۔ وہ ہمیں ا
کھولی میں لے گیا اور ایک برکلے کا سگریٹ دے کر بولا۔

"ابہام بھائی۔ تم ادھر چھپ کر پیو۔ ورنہ یہ سگریٹ سالا بری
ادھر میں چھپا کر رکھا تھا۔"

جیل میں کہیں کوئی چھپنے کی جگہ تو نہیں تھی۔ لیکن میں اور علوی کھ
کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے اور یکے بعد دیگرے ایک ایک کش
لطف اندوز ہوتے رہے۔

ابھی ہم نے سگریٹ کشی ختم بھی نہ کی تھی کہ باہر سے ایک آواز آئی
"چلو رے چلو۔ تو نوا قیدی بھار آؤ۔"

میں نے علوی سے پوچھا۔

"کیوں کیا قصہ ہے ——— ؟"

علوی نے بتایا کہ جو بھی نیا قیدی جیل میں داخل ہوتا ہے۔ اسے
دوسرے دن ڈاکٹر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد قطعاً یہ نہ
ہوتا کہ جیل کے اربابِ اقتدار کو قیدی کی صحت کی فکر ہوتی ہے بلکہ وہ قید
کے چہرے مہرے اور جسم کے قابلِ شناخت نشانات کو دیکھ کر درج رجسٹر کر
ہیں یعنی وہی "سند رہے اور عندالضرورت کام آنے والی بات ہے!"
علوی نے کہا۔

"جاؤ۔ ہو آؤ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جب مجرموں کے رجسٹر میں
نام لکھوایا ہے۔ تو پھر گال کے خال کے اندراج کی کیا پرواہ ——— !"

میں کھولی سے باہر نکلا تو شریف خاں نے آواز دی۔

"اوئے ملباری دے پتر۔ یہ نیا قیدی ہے اسے لے جا۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جاؤ جی جلیس صاحب جاؤ۔ ذرا ڈاکٹر کی بھی زیارت کر آؤ۔ اس
سے مل کر بہت خوش ہوں گے آپ! ہی ہی ہی......"۔

ملباری واچ مین کے ساتھ اپنے وارڈ سے نکل کر جب پھر میں چکر
کے گول دائرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ چکر کے چاروں بارکوں کے نو وارد
قیدی کھڑے ہیں۔ جن میں وہ دونوں قیدی عابد حسین لکھنوی اور یونس رفیق
بھی تھے جن سے کل میری جان پہچان لاک اپ میں ہوئی تھی۔ رفیق کا مزید
تعارف اس لئے بیکار ہے کہ کل رات جب یہ پندرہ سولہ سالہ خوش شکل
لڑکا لاک اپ میں سو رہا تھا تو کوئی چار بجے کے قریب پہرے کے سپاہی نے
اپنا چارج دوسری شفٹ کے سپاہی کو دیتے ہوئے کہا تھا۔

"تیرہ قیدی" ان میں سے ایک مال۔"

مال کے لفظ پر نئی شفٹ کا سپاہی چونک پڑا تھا اور بڑی بے تابی
سے سلاخوں سے جھانک جھانک کر رفیق یا "مال" کو دیکھتا رہا تھا۔ عابد حسین لکھنوی

وہی بزرگ تھے جو یا تو خارش میں مبتلا تھے یا پھر مفلسی میں ۔ اور جنہوں نے اپنے
پیپ بھرے ہاتھ میری ران پر ٹپکا کر میراجی بولا دیا تھا۔

دُبلا ۔ کالا ۔ لمبا موٹے موٹے ہونٹوں والا مالاباری واچ مین پُکار اُٹھا۔

"چلو رے چلو ۔ جوڑی جوڑی ہو جاؤ۔"

سارے قیدی جوڑی جوڑی ہونے لگے ۔ اچانک میں نے دیکھا ایک قیدی
جس نے ہلکے سبز رنگ کا سوٹ پہنا ہوا ہے بے حد شوخ رنگ کی نکٹائی لگا رکھی
ہے اور سر پر کالے رنگ کی جناح کیپ بھی اوڑھی ہوئی ہے بڑی بے تکلفی
سے میری طرف آرہا ہے ۔ اور مجھے پُکار رہا ہے ۔

"ہلو مسٹر ______ ہلو ہیر آر یو اینڈ ہاؤ ڈو یو ڈو مائی فرینڈ۔"

میں سمجھا میرا واقف کار ہو اور میں اسے بھول گیا ہوں ۔ ابھی میں اسکے
بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ میرے پاس آگیا ۔ اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ
ملایا اور بولا ۔

"آؤ میرے ساتھ جوڑی ہو جاؤ ۔ میں دراصل تم ہی جیسے شریف آدمی
کو اپنا جوڑی بنانا چاہتا تھا یہاں سارے قیدیوں میں مجھے اپنے مرتبہ کا کوئی آدمی
تمہارے سوائے نظر ہی نہیں آتا۔"

میں بڑا اپٹپٹایا جوڑی ہونے کا مطلب سوائے اس کے کیا ہے کہ دو دو
قیدیوں کی ایک قطار بنائی جائے ۔ اسکے لئے ہم مرتبہ ہونے کی کیا ضرورت ہے جبکہ

یہاں سب قیدی ہیں ۔ میں سوچنے لگا عجیب آدمی ہے ۔ پھر سوچا کہ معلوم
ہوتا ہے کہ یہ انسان کی بڑائی اور چھوٹائی اور رتبہ و درجہ کا بڑا قائل ہے اور
ممکن ہے مجھے اچھی طرح جانتا ہو ۔ ورنہ ان پچیس تیس قیدیوں میں سے صرف
مجھے انتخاب کرنا کیا معنی رکھتا ہے ۔

ہم دونوں جوڑی بن کر قطار میں شامل ہو گئے اور قطار چلنے لگی چکّر
سے باہر نکلی اور ہسپتال کی طرف چلی ۔

چلتے چلتے میرے جوڑی دار نے مجھے ایک بار اور گویا دریائے حیرت
میں دھکیل دیا ۔ اس نے مجھ سے پوچھا ۔

"تم کون ہو؟"

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا ۔

"تو کیا آپ مجھے نہیں جانتے ۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ......" اس نے
ایک قہقہہ لگا کر جواب دیا ۔

"کیا تمہارے ماتھے پر نام لکھا ہے جو میں پہچان لوں .... واہ یہ بھی
خوب رہی!"

مجھے بڑی کوفت ہونے لگی ۔ اس نے پھر پوچھا ۔

"ہاں تو بتاؤ ، تمہارا نام کیا ہے ______ ؟"

میں نے بے رُخی سے جواب دیا ۔

"ابراہیم جلیل۔"

"ابراہیم جلیل ــــ اچھا تو کس جرم میں اندر آئے ہو!"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ یہ تو ایسے ہی سوالات پوچھ رہا ہے جیسے جرح کر رہا ہو۔ میں نے عمداً کوئی جواب نہیں دیا۔ صاف ٹال گیا لیکن اس نے میری گدی پر قمیص کا کالر اس زور سے کھینچا کہ پیچھے سے قمیص کا تھوڑا سا دامن باہر نکل آیا مجھے اس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا اور میں نے غضب ناک ہو کر اسے ڈانٹا۔

"عجیب بے ہودہ اور بدتمیز آدمی ہو تم۔ تمہیں بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں اور اپنے آپ کو بڑا معزز آدمی ظاہر کرتے ہو۔"

لیکن میرے غصے کا جواب اس نے ایک قہقہہ سے دیا۔ مجھے اور بھی غصہ آیا لیکن مجبوری کہ میں جوڑی سے بھی نہیں نکل سکتا تھا کہ کہیں ملباری "واچ مین" مجھے ایک فحش گالی نہ دے مارے اور ان سارے نئے قیدیوں اور بالخصوص عابد حسین اور رفیق کے سامنے میری بے عزتی ہو جائے۔ میں چپ چاپ چلنے لگا تو اس نے بڑی محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر بڑے پیار سے پوچھا۔

"گاٹ اینگری مائی فرینڈ ــــ؟"

میں نے اس کا ہاتھ نفرت سے جھٹک کر کہا۔

"ہٹاؤ میرے کندھے پر سے ہاتھ۔"

لیکن اس پر بھی وہ برا نہ مانا اور نفرت سے جھٹکے ہوئے ہاتھ کو پھر ایک بار میرے کندھے پر پھیلا دیا۔ میں نے سوچا یہ اسی طرح تنگ کرتا رہے اس لئے خاموش رہنا ہی سب سے بڑی مصلحت ہے۔ میں تو خاموش ہو گیا۔ مگر وہ بھلا کہاں خاموش رہنے والا تھا۔ دایاں ہاتھ مصافحہ کے لئے میری طرف بڑھا کر بولا۔

"اچھا تو پھر ملاؤ قورمے کا ہاتھ۔ اب تمہاری دوستی۔ لاؤ بھئی لاؤ ملاؤ پلاؤ کا ہاتھ ملاؤ۔"

مجھے اس بے حیا انسان کی اس حرکت اور قافیہ بندی پر ہنسی آ گئی۔

میں نے بھی سوچا چلو ملا ہی لو "پلاؤ کا ہاتھ" حرج ہی کیا ہے ــــ؟

پلاؤ کا ہاتھ ملانے کے بعد پھر اس کی گفتگو کا چلاؤ ہونے لگا۔ اس نے پوچھا۔

"تو سناؤ بھئی ابراہیم جلیل۔ باہر تم کیا کرتے تھے؟"

میں نے جواب دیا۔

اخبار "امروز" میں کام کرتا تھا۔ میں وہاں ....."

اس نے اتنا ہی سن کر میری بات کاٹی۔

"اخبار امروز ــــ اچھا وہ میاں افتخار الدین کا اخبار۔ تمہیں شاید پتہ

نہیں کہ میاں افتخار الدین میرا کتنا گہرا یار ہے۔ وہ بھی جالندھر کا رہنے والا ہے
میں بھی جالندھر کا رہنے والا ہوں۔ تم مجھے نہیں جانتے میں میاں امین الدین
جالندھری ہوں۔"

میں نے کہا۔

"جناب وہ جالندھر والا میاں افتخار الدین کوئی" امروز جدید" قسم
کے اخبار کا مالک ہوگا۔ یہ میاں افتخار الدین تو باغبان پورہ لاہور کا رہنے
والا بڑا جاگیردار اور بہت ہی مشہور سیاسی لیڈر ہے۔ سمجھے؟"

وہ قطعاً نہیں جھینپا بلکہ اسی دیدہ دلیری سے بولنے لگا۔

"تم بچے ہو، تمہیں کیا معلوم۔ میں اس کو بچپن سے جانتا ہوں۔ میں میاں
افتخار الدین اور لیاقت خان تینوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے
رہے ہیں!"

پیرس کی آکسفورڈ یونیورسٹی! میری رگِ شرارت پھڑک اٹھی۔ میں
سمجھا کہ یہ بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد وہ
یہ بھی کہہ دے کہ امروز کا اصلی مالک وہی ہے۔ میں نے سوچا اس کو ذرا
چھیڑنا چاہیئے۔ میں نے کہا۔

"حضرت پیرس کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھنے والے تو جیل کی
بجائے پاگل خانہ جاتے ہیں۔ آپ کیسے راہ بھول پڑے؟"

یہ سن کر وہ ہنس پڑا۔ لیکن اچانک غصے میں آگیا اور بولا۔

"بدتمیز ——— میرا مذاق اڑاتے ہو!"

میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ اخلاق کا سلوک کرنا محض بیکار
ہے۔ اس لئے جواباً بڑی بے پروائی سے بولا۔

"ارے ہٹاؤ۔ میرا بس چلے تو تمہارا مذاق اڑانے کے بجائے تمہیں خود
کو اڑا دوں۔ کہو منظور ہے؟"

امید تو یہ تھی کہ وہ اس جواب پر اور زیادہ برافروختہ ہو جائے گا لیکن
خلافِ توقع وہ خاموش رہا اور ہسپتال پہنچنے تک وہ خاموش ہی رہا۔

ہسپتال ایک اداس سی عمارت تھی مالاباری وارڈن نے میرے
علاوہ سارے قیدیوں کے ہاتھ میں جھاڑو تھما دی۔ سارے قیدی ہسپتال کے
سامنے زمین پر جھاڑو دے رہے تھے۔ میں برآمدے کی ایک کمان میں دونوں
گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں میں تھامے چپ چاپ
بیٹھ گیا اور سامنے ان انسانوں کو دیکھنے لگا جو جھاڑو لگا لگا کر زمین کو صاف
کر رہے تھے لیکن جنہوں نے کبھی اپنی زندگی کو اپنی جھاڑو نہیں لگائی تھی۔
اور جنہوں نے اپنی زندگی اپنے اعمال اور اپنے اخلاق کے کوڑے کرکٹ کے
ڈھیروں کو کبھی صاف کرنے کا خیال تک دل میں نہ لایا ہوگا۔

اچانک شور مچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا جوڑی ——— اسی

افتخار الدین اور لیاقت علی خان کے ہم جماعت اور آکسفورڈ یونیورسٹی بیرسٹر کے گریجویٹ میاں امین الدین جالندھری نے جھاڑو دور کر دٹن کی باڑھ پر اٹھا کر پھینک دی ہے اپنا کوٹ شیشم کے درخت پر لٹکا دیا ہے اور قمیص اتار کر ایک گیند کی شکل بنا کر دور اس طرح پھینک دی جیسے وہ کرکٹ کا باؤلر ہے۔ ان حرکات کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور بیرسٹر کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پا چکا ہے اور وہ بلاشبہ لیاقت علی خان اور میاں افتخار الدین کا ہم جماعت ہے۔

مالابادی" وارچ مین" اور انچارج سپاہی دونوں نے اس کو پکڑ لیا تھا اور اسے دھول دھپہ بھی لگا رہے تھے۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قریب جا کر بڑے غصہ سے بولا۔

"یہ شخص ـــــ میں جانتا ہوں کہ اس شخص کی ذہنی حالت خراب ہے یہ پاگل ہے تمہیں اس پر ترس کھانا چاہیئے اور تم ہو کہ بے چارے کو پیٹ رہے ہو۔"

سپاہی نے عام سپاہیانہ رعونت کے ساتھ جواب دیا۔

"تم کون اس کے چچا لگتے ہو۔ بکواس بند کرو اور اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔ اگر تم "سیفٹی" نہ ہوتے تو تمہیں بھی بتا دیتا کہ میرا ڈنڈا کتنا مضبوط ہے!"

میں نے جواب دیا۔

"میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا ڈنڈا کتنا مضبوط ہے۔ میں یہ

بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس طاقت نے تمہیں یہ ڈنڈا دیا ہے وہ کتنی مضبوط ہے لیکن یاد رکھو جب بھی یہ ڈنڈا کسی انسان پر برسا ہے تو ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے اور انسان بالکل صحیح و سالم رہا ہے۔"

اسی اثناء میں سارے قیدی ہم لوگوں کے ارد گرد جمع ہو گئے اور ہر قیدی سپاہی کی منت سماجت کرنے لگا کہ یہ شخص چریا ہے یہ شخص پاگل ہے اس کا دماغ چلا ہوا ہے۔ معاف کر دو سائیں!"

معلوم نہیں، قیدی یہ بات میرے لئے کہہ رہے تھے یا پھر میاں افتخار الدین اور لیاقت علی خان کے ہم جماعت میاں امین الدین کے بارے میں۔ بہرحال سپاہی نے میاں امین الدین کو معاف کر دیا اور بولا۔

"تم وہاں جا کر چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب آئے گا تو ہم تم سے سمجھ لے گا۔"

میاں امین الدین میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دوسرے قیدی پھر جھاڑو لگانے میں مشغول ہو گئے۔ امین الدین نے پھر میرا دماغ کھانا شروع کر دیا اس نے شاید یہ سمجھا ہو کہ میں اس کا بڑا ہمدرد ہوں۔ اور اسی لئے میں نے اسے سپاہی اور وارچ مین کی مار سے بچایا ہے لیکن میں میاں امین الدین کا ہمدرد نہیں تھا۔ بلکہ میں تو ہر اس انسان کا ہمدرد ہوں جس کے سر پر کسی سپاہی اور کسی استبدادی طاقت کا ڈنڈا لہراتا ہے۔ اب جب کہ وہ سپاہی کے ڈنڈے کی زد

سے باہر ہے۔ مجھے اس سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

میاں امین الدین نے مجھ سے بات کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ اس نے پوچھا۔

"ارے بھئی کیا تم یکایک بہرے ہو گئے ــــــ؟"

میں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے ایک سوال کا بھی جواب دیتا تو وہ پھر مجھے باتوں کی دلدل میں اتار دیتا اور پھر میں اندر ہی اندر دھنستا چلا جاتا۔

اسی اثنا میں ہسپتال کی عمارت سے ایک کالی بلی باہر نکلی میاؤں میاؤں کر کے پہلے تو اس نے ایک انگڑائی لی۔ اور پھر بڑے ٹھاٹھ سے آہستہ چلنے لگی میاں امین الدین نے بلی کو غور سے دیکھا۔ چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھا۔ دبے دبے پاؤں اس کے قریب گیا اور اچانک اسے پکڑ لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے سی۔ آئی۔ ڈی کے سپاہی کسی کارکن کو پکڑ لیتے ہیں۔

بلی بڑی میاؤں میاؤں کرتی رہی۔ بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن گرفتاری گرفتاری ہی ہوتی ہے۔ میاں امین الدین بلی پکڑ کر میرے پاس پھر آبیٹھا۔ اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

"میری پیاری بلی! اگر کوئی ہم سے بات نہیں کرتا ہے تو نہ کرے۔ میں تم سے بات کروں گا اور تم مجھ سے بات کرو گی!"

اس نے اپنی نکٹائی جو درزی کے ٹیپ کی طرح اس کی گردن میں پڑی ہوئی تھی بلی کے گلے میں باندھ دی تاکہ وہ بھاگنے نہ پائے۔

تھوڑی دیر گزر گئی۔

سپاہی نے سارے قیدیوں سے کہا۔

"اوئے چلو' سب کے سب۔ دیوار سے لائن بنا کر بیٹھ جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں!"

میں نے دیکھا۔ سامنے سے سفید ٹوئیڈ کی پتلون اور سفید سرک کی قمیص میں ملبوس ایک دبلا پتلا، کچھ کچھ خمیدہ پشت ایک شخص چلا آرہا ہے جس کے گلے میں ایک "استھسکوپ" لٹک رہا ہے اور ہونٹوں میں ایک بیڑی جل رہی ہے۔ "تو یہ تو ہے جیل کا ڈاکٹر" ایک غلط سا فارسی مصرع ذہن کے کسی گوشے سے ابھر آیا کہ۔ [illegible] کارِ مریضاں تمام خواہد شد۔

ڈاکٹر صاحب ہسپتال کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ مالا باری' وارڈ مین' نے ہم قیدیوں کے پاس آ کر حکم دیا۔

"اپنی اپنی قمیص اور بنیان اتار دو!"

میں نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک قیدی سے پوچھا۔ کیوں قمیص اور بنیان کیوں اتار دیں؟ وہ قیدی شاید کئی بار جیل آچکا تھا۔ اس لئے اس نے سابقہ تجربات کی روشنی میں جواب دیا۔

"بابو۔ یہ یہاں کا تریکا (طریقہ) ہے بس!"

سب قیدیوں کے ساتھ میں نے بھی اپنی قمیص اور بنیان اتار دی اور ننگے بدن پھر وانڈے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے مجھے اندر بلا لیا۔ ڈاکٹر نے پہلے تو میرے بدن کے نشانات اور تلوں کو نوٹ کیا۔ اس کے بعد اسٹیتھسکوپ لگا کر میرے دل کی دھڑکنیں گننے لگا۔ کاش ڈاکٹر اس اسٹیتھسکوپ کے ذریعے یہ بھی محسوس کر سکتا کہ میرے دل میں اس نظام کے خلاف کیا کیا ہے۔ جس نے سچ بولنے کے عوض مجھے سنگ و آہن کے اس احاطے میں اس طرح رسوا اور عریاں بنا رکھا ہے ــــ!

اس کے بعد ڈاکٹر نے کہا "جاؤ وہاں اپنا وزن کراؤ!" میں وزن ناپنے والی مشین کے پاس گیا۔ اس مشین کے پاس ایک میز پر ایک بہت بڑے رجسٹر پر منہ اوندھائے ایک نوجوان سا لڑکا قیدی لباس میں ملبوس بیٹھا تھا اس کی آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا اور صورت شکل بڑی جانی پہچانی سی معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ یاد نہیں پڑتا۔ مگر دیکھا ضرور ہے جلیس کسی نہ کسی دوست سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"اس مشین پر کھڑے ہو جاؤ۔"

میں مشین پر کھڑا ہو گیا۔ کانٹا زیرو سے گھوم گیا۔ اس کیا ؤنڈ نما قیدی نے شیشے کے تاوں سے گھور کر ڈائیل کو دیکھا اور بولا "ایک سو اکتیس

پونڈ۔"

"اچھا اب ادھر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔"

دیوار پر ایک اسکیل بنائی گئی تھی۔ اپنے ہولڈر کو میرے سر کے بالوں میں داخل کر کے اس کی نوک دیوار سے لگا دی اور اپنے آپ سے بولا۔

"پانچ فٹ دس انچ۔"

پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہولڈر کی نب دوات میں کھڑکھڑا کر مجھ سے پوچھا۔

"تمہارا نام ــــ؟"

میں نے جواب دیا۔

"ابراہیم جلیس۔"

یہ سنتے ہی اچانک اس نے قلم رجسٹر پر رکھ دیا اور کرسی سے کھڑا ہو کر بولا۔

"ارے ــــ ارے جلیس ــــ جلیس!!"

میں نے حیرانی سے اس سے پوچھا۔

"آپ مجھے جانتے ہیں ــــ؟"

اس نے جواب دیا۔

"خوب ــــ! بہت اچھی طرح جانتا ہوں آیئے ذرا باہر چلیں اب آپ قمیص پہن لیجیئے۔"

میں بنیان اور قمیص پہنتا ہوا ہسپتال سے باہر آگیا اس نے کہا "میرا نام شرف علی ہے۔ میں ٹریڈ یونین ورکر ہوں اور پچھلے ڈیڑھ سال سے سیفٹی ایکٹ میں نظر بند ہوں!"

میں نے پوچھا۔

"آپ اشرف علی کے بھائی تو نہیں ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔

"ہاں میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں، آیئے میری کھولی میں چلئے۔"

شرف علی کی کھولی مریضوں کے وارڈ میں تھی۔ شرف علی بیمار نہیں تھا بلکہ وہ ہسپتال میں کمپاؤنڈر کی طرح اعزازی کام انجام دیا کرتا تھا کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس میں انسانی خدمت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ اس نے جیل میں بھی اپنے سارے وقت کو بیمار قیدیوں کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا وہ قیدیوں میں بڑا ہر دلعزیز تھا میں نے مختصر سی ملاقات ہی میں اندازہ لگا لیا کہ قیدی اپنے "شرف بابو" سے کتنی عقیدت رکھتے ہیں۔

شرف علی کی کھولی مریض قیدیوں کے ایک لمبے وارڈ سے متصل تھی۔ یہ دراصل اے اور بی کلاس کے مریض قیدیوں کے لئے تھی جس میں دو پلنگ پڑے ہوئے تھے ایک شرف علی کا تھا۔ دوسرا ایک (شاید قریب المرگ) بی کلاس قیدی غلام علی کا تھا۔ غلام علی کو "پلوریسی" کا مرض تھا اور اب جیسے وہ برائے نام زندہ تھا بے حد

پیلا "ڈراؤنا چہرہ" بید کی چھڑیوں جیسے پتلے پتلے ہاتھ پاؤں، اور دم لبوں پر۔ وہ اپنی آنکھیں پھاڑے لوہے کی سلاخوں والے دروازے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے "...... آنکھوں میں تو دم ہے" کہہ رہا ہو۔ جانے وہ اس لوہے کی سلاخوں والے دروازے کو کیوں اتنی خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ اسے موت یا پھر زندگی کا دروازہ سمجھ رہا ہے؟

شرف علی نے میرا اس سے تعارف کرایا غلام علی کسی فرم میں فریب دہی اور خرد برد کے الزام میں کوئی ڈیڑھ سال سے گرفتار اور "زیر دریافت" تھا اس کا مرض بے حد خطرناک ہو گیا تھا اور اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ آج یا کل، کل یا پرسوں نہ صرف کراچی ڈسٹرکٹ جیل سے بلکہ زندگی کی جیل سے بھی آزاد ہونے والا ہے۔ ابھی کہ ابھی آسمانوں سے اس کا پروانہ رہائی آئے گا۔ اور وہ رہا ہو جائے گا۔

میں نے شرف سے پوچھا۔

اسے باہر کسی ہسپتال میں کیوں نہیں بھیج دیا جاتا۔ یہ یکمشت پوست واستخوان اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہیں سکتا تو یہ کس طرح فرار ہو سکتا ہے"۔

شرف علی نے بڑے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"اگر قیدی مریضوں کو باہر کے ہسپتال بھیجا جایا کرے تو پھر سارے آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والا بے چارہ غریب میڈیکل آفیسر بھوکوں

مرنے لگے گا۔ وہ اپنی نوکری کو برقرار رکھنے کیلئے اور اپنی کارکردگی دکھانے کیلئے غلام علی جیسے مریضوں کا مرنے تک بھی ہسپتال میں رکھنا نہایت ضروری سمجھتا ہے۔"

غلام علی نے بھی یہ بات سن لی تھی اس نے بڑی کمزور اور منمنی سی آواز میں کہا۔

"ہم قیدی ہیں۔ یہاں ہمارے مرض پر جرم اور ہماری زندگی پر ہماری موت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہاں کتنے مریض ہیں۔ یہاں سب صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جیل میں کوئی ہسپتال ہے یا نہیں ہے!"

شرف علی مسکرایا اور مجھ سے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"غلام علی بمبئی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے اور انگریزی میں شعر بھی کہتا ہے اب شاید اس پر یہی فلسفیانہ قسم کی شاعری کا موڈ طاری ہے۔"

میں نے شرف علی سے کہا۔

"مجھے اس کی فلسفیانہ شاعری ناپسند نہیں ہے لیکن خدارا ایک بات بتاؤ "پلوریسی" کوئی متعدی مرض تو نہیں ہے۔ مجھے تو اس شخص سے بڑی وحشت ہو رہی ہے!"

شرف علی ہنس پڑا اور بولا۔

"میں پچھلے ڈیڑھ سال سے اس کے ساتھ اسی کھولی میں رہتا ہوں لیکن "پلوریسی" کے متعدی مرض ہونے کے باوجود مجھے کچھ نہیں ہوا ——

جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ خود بڑے فخریہ لہجے میں بولا۔

"اس لئے کہ میں ایک کمیونسٹ ہوں اور کمیونزم انسان کی مکمل صحت کا نام ہے اس پر کوئی بیماری اثر نہیں کر سکتی۔"

اس کے جواب کو سن کر میں بغور اس ڈھیلے پتلے نوجوان کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص ڈیڑھ سال سے قید میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن اس کا عقیدہ کتنا آزاد ہے اور یہ کس آزادانہ طور پر گفتگو کر رہا ہے ....

...... پچھلے اٹھارہ مہینے سے لوہے اور پتھر کی صحبت نے شرف علی کے عقیدے کو اور بھی زیادہ آہن، اور، اور بھی زیادہ سنگینی عطا کی ہے۔

اس نے مجھ سے کہا۔

"تم اس طرح مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ بیٹھو یہاں پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔"

میرے پلنگ پر بیٹھ جانے کے بعد اس نے کہا۔

"کل شام میں نے "پاکستان ٹائمز" میں تمہاری گرفتاری کی خبر پڑھی اور تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا...... دیکھو یہی وہ پاکستان ٹائمز کا پرچہ ——!"

میں نے دیکھا کہ پاکستان ٹائمز کے صفحہ اول پر ایک باکس میں وہ ابراہیم جلیس جکڑا ہوا ہے۔ جو ایک ترقی پسند ادیب ہے اس خبر کے علاوہ مجھے سارا اخبار دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ تین روز ہو چکے تھے۔ میں اخبار کے لئے ترس رہا تھا

میں جو کہ ہر ناشتے کے بعد ایک گھنٹے تک اخبار پڑھنے کا عادی ہوں گذشتہ تین دنوں سے دنیا سے بھی کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ میں نے سرسری طور پر سارا اخبار پڑھ لیا اور تفصیل سے پڑھنے کی خاطر اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو شرف علی نے بتایا کہ سی کلاس میں اخبار پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ساتھ نہ لے جاؤ۔ البتہ میں شام کو کسی ذریعے سے اخبار تم تک پہنچا دوں گا۔"

شرف نے یہ بھی کہا۔

"تمہیں اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے بلا تکلف کہہ دینا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ سگریٹ، چائے اور اخبار یا کتابیں۔ سگریٹ تو سب سے زیادہ ضروری ہیں۔"

شرف نے کہا۔

"سگریٹ تو بغیر میڈیکل افسر کی اجازت کے نہیں مل سکتے، وہ ابھی ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آئے گا تو میں اس سے کہہ کر تمہارے ہسٹری ٹکٹ پر سگریٹیں منظور کروا لوں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"ہسٹری ٹکٹ کیا ہوتا ہے؟"

اس نے جواب دیا کہ ہر قیدی کا اعمال نامہ۔ جس پر اس کا فرد جرم اس

کی ملاقاتیں اس کا وزن وغیرہ درج کیا جاتا ہے۔

اس نے تکیے کے نیچے سے ایک بیڑی کا بنڈل نکالا اور مجھ سے بولا۔

"میڈیکل افسر پانچ سگریٹ سے زیادہ منظور نہیں کرتا۔ ویسے میں تمہارے لیے زیادہ کوشش کروں گا۔ میں نے تو براہ راست ایڈ منسٹریٹر سے "اسموکنگ" کی اجازت لی ہے اور ایڈمنسٹریٹر نے مجھے روزانہ ۳۰ بیڑی منظور کی ہیں۔ اگر تم بیڑیاں پینی چاہو تو فی الحال یہ پانچ چھ بیڑیاں اپنے پاس رکھ لو۔"

میں نے زندگی میں کبھی بیڑی نہیں پی تھی۔ لیکن مجبوراً میں نے دو بیڑیاں لے لیں۔ ایک بیڑی جلائی تھی کہ سامنے دیکھا۔ پانچ چھ قیدی بڑی طلب آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے شرف سے پوچھا۔

"یہ لوگ کیوں جمع ہو گئے ہیں؟"

شرف نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک کش کی خاطر ـــ سمجھے! اچھا جب تم بیڑی پی چکو تو پھینکنا نہیں ان بے چاروں میں سے کسی ایک کو دے دینا۔"

دو ہی کش کے بعد مجھے بیڑی کے تلخ دھوئیں کا ٹھسکہ لگا اور میں نے بری طرح کھانستے ہوئے بیڑی ایک قیدی کی طرف بڑھا دی۔ بس پھر کیا تھا سارے قیدی جھپٹ پڑے اور ان میں چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔

میں اس منظر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا کہ شرف نے کہا "کیا غور

سے دیکھ رہے ہو۔ بیڑی کی خاطر جیل میں کیا کیا کچھ ہوتا ہے۔ تمہیں آہستہ
آہستہ خود معلوم ہو جائے گا۔ بیڑی جیل کا ڈالر ہے ڈالر۔ سمجھے!"

اس وقت ہسپتال کا واچ میں آیا اور بولا۔

"شرف بابو ___ میڈیکل بابو آیا ہے۔ تمہیں بلاتا ہے۔"

شرف نے مجھ سے کہا۔

"آؤ میڈیکل افسر سے سگریٹ منظور کروالیں۔"

میڈیکل افسر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اور دروازے کی دہلیز میں بیٹھا
ہوا ایک قیدی پنکھا قلی کی طرح ڈوری کھینچ کھینچ کر "میڈیکل بہادر" کے سر پہ
پنکھا جھل رہا تھا۔ ویسے دن کافی ٹھنڈا تھا۔ ویسے بڑے آدمی بڑے گرم مزاج
ہوتے ہیں۔ اور ان کے مزاج پہ سدا ایک ہی موسم طاری رہتا ہے ___ گرمی

میں جس وقت میڈیکل بہادر کے اجلاس میں پیش ہوا تو دیکھا کہ
میرا دیوانہ دوست "میاں امین الدین" بھی وہاں کھڑا ہے۔ جسم پر قمیص نہیں
ہے صرف پتلون اور سر پر جناح کیپ ہے۔ ہاتھ میں وہی کالی بلی ہے جس
کے گلے میں اس نے اپنی نکٹائی بالکل اسی طرح باندھی ہے جس طرح ہم آپ
باندھتے ہیں اور بلی کو چمکار چمکار کر کہہ رہا ہے۔

"چرچرچر ___ چرچرچر ___ جاؤ بیٹا ___ جاؤ صاحب سے میرے
لئے سفارش کرو کہ مجھے پندرہ سگریٹ منظور کر دے۔ جاؤ چرچرچر ___

ڈارلنگ کیٹ گو ___ گو آن!"

بلی میاؤں میاؤں کر کے سفارش کرنے لگی۔ پہلے تو میڈیکل افسر صاحب
بڑے برہم ہوئے۔ لیکن میاں امین الدین اور ان کی ڈارلنگ بلیا نے ان کا
ایسا سر کھپایا کہ انہوں نے تنگ آ کر اس کے ہسٹری ٹکٹ پر یومیہ تین سگریٹ
پینے کی اجازت تحریر کر دی۔

میری باری آئی۔ شرف نے میرا تعارف کراتے وقت میری سیاسی اور
ادبی حیثیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ میری ہر ممکن تعریف کے بعد اپنے اثر و
رسوخ کو بھی کام میں لانا چاہا لیکن سنا کہ میڈیکل افسر صاحب بڑے اصولوں
کے پابند تھے۔ انہوں نے میری ہسٹری ٹکٹ پر صرف پانچ سگریٹ اور احمد
علی کے ہسٹری ٹکٹ پر صرف تین سگریٹ منظور کئے۔

میں نے مزید کچھ درخواست کرنی چاہی۔ لیکن عام افسروں کی طرح
انہیں غصہ آ گیا اور بڑے افسرانہ یا غصیلے انداز میں بولے۔

"اگر آپ مجھ سے بحث کریں گے۔ تو میں ان پانچ سگرٹوں کو بھی
کاٹ دوں گا۔"

شرف نے مجھے خاموش رکھنے کے لئے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا اور
میں نے "میڈیکل افسر کے پانچ سگریٹ ہی سہی" پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔

ہم باہر نکلے تو "مالا باری" واچ میں "آوازیں لگا رہا تھا۔

"چلو جوڑی جوڑی"

سارے قیدی جوڑی جوڑی ہو گئے۔ اور میں میاں امین الدین سے بچنے کی خاطر میں اپنے لاک اپ کے ساتھی خارش زدہ یا مفلس میں مبتلا حضرت عابد حسین لکھنوی کا جوڑی ہو گیا۔

اس کے بعد ہم سب پھر "چکر" میں داخل ہو گئے۔

واہ رے جیل کے چکر۔!

اور ہائے رے قسمت کے چکر۔!!

(۴)

اپنے سیفٹی وارڈ میں پہنچا تو وہاں ہلڑ سا مچا ہوا تھا۔ شریف خاں نے دودا کی وہ پھٹی ہوئی نیکر چھین لی تھی۔ جسے وہ ایک کونے میں بیٹھا چیتھڑے لگا لگا کر سی رہا تھا۔ دودا ایک ستون کی آڑ میں برہنہ کھڑا تھا رو رو کر اپنی نیکر مانگ رہا تھا اور شریف خاں۔ محمد مکرانی۔ ببری۔ علی محمد۔ حتیٰ کہ چندر کمار تک ٹھٹھے مار مار کر ہنس رہے تھے۔

دودا ایک پچاس پچپن سال کا بوڑھا ہندو ہے۔ بریلی یوپی کا باشندہ ہے پچھلے سترہ سال سے کراچی میں کسی ہندو ساہوکار کے پاس نوکر تھا اور اپنے مالک کے قتل کے شبہ میں پکڑا گیا تھا۔ اگر بڑھاپا واقعی "دوسرے بچپن" کا نام ہے تو دودا بھی بلا شبہ ایک پچاس پچپن سالہ معصوم بچہ ہے۔ اسکی حرکات و سکنات

اس کی بات چیت اور اس کی فطرت بالکل بچوں جیسی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی
تھی کہ اتنا بھولا بھالا اور اتنا معصوم آدمی قتل جیسے بہیمانہ فعل کا کس طرح
مرتکب ہو سکتا ہے؟ دودا کو دیکھ کر مجھے ایک پرانا مقولہ "قانون اندھا ہوتا ہے"
بالکل سچ معلوم ہوتا تھا۔

دودا بھی سب قیدیوں کی طرح ایک عام قیدی تھا لیکن سارے قیدی
اس سے اپنے نوکر کی طرح کام لیتے تھے۔ کوئی اس سے اپنے کپڑے دھلواتا۔ کوئی
پھٹی ہوئی قمیص سلواتا۔ کوئی نلکے سے پانی لانے کیلئے اپنی مٹکی اس کے سر پر رکھ
دیتا۔ بارک انچارج سپاہی تو ہر دوپہر دودا سے اپنے پھوڑے پھنسیوں والے جسم
کی مالش کراتا تھا۔

دودا ہر ایک کا کام اور ہر ایک کی خدمت بلا چون وچرا بجا لاتا تھا۔ میں
سمجھتا تھا کہ دودا جیل کے سارے قیدیوں سے ڈرتا ہے لیکن اسی دن جب میرے
کہے بغیر دودا میری قمیض اور بنیان حوض پر سے دھو لایا تھا اس لئے مجھے یقین ہو گیا
کہ غلامی دودا کی فطرت ثانی بن چکی ہے وہ ایک نوکر کا لڑکا تھا۔ خود بھی نوکر ہی
پیدا ہوا تھا پچھلے پچاس پچپن سال اس دنیا میں نوکری ہی کرتا رہا ہے۔ نوکری یا
غلامی اسکے جسم میں اور اس کے خون میں کچھ اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اب شاید وہ
اسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جبکہ اسکی غلام روح اسکے جسم سے آزاد ہو جائے۔

دودا مجھے ہندوستان کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا وہ بت نظر آرہا تھا جسے

غلامی کے اندھیرے غار سے نکال کر آزادی کے اجیالے مندر میں بٹھا دیا گیا ہے
لیکن اسکے باوجود اس کا سر جھکا ہوا ہے اور اس کی پشت خمیدہ ہے۔!

دودا پر مجھے بڑا رحم آیا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو
رہا تھا۔ میں نے شریف خان سے کہا۔

"شریف بھائی ہٹاؤ، کیا غریب آدمی کو ستا رہے ہو۔ لاؤ اسکی نیکر مجھے
دے دو!"

شریف خان نے جواب دیا۔

"ذرا ٹھہرو جلیس صاحب! ایمان سے بڑا "لطف" آ رہا ہے! لیکن میں
نے شریف خان کے ہاتھ سے دودا کی نیکر چھین لی اور دودا کی طرف پھینک دی۔
دودا نے ہاتھ بڑھا کر نیکر اٹھالی اور پہن کر میرے پاس آیا۔ میں نے یونہی دودا سے
پوچھا۔

"دودا تم اتنے بوڑھے آدمی ہو کر اتنے ذرا سے مذاق پر روتے کیوں ہو؟"

دودا نے میرے سوال کا بڑا ہی عجیب وغریب جواب دیا۔

"بابو جی میں مذاک کا برا نہیں مانت ہے۔ مجھے تو یہ دیکھ کر تکلیف ہووت
ہے کہ چندر کمار بھی میرے پر ہنسوت ہے۔"

اس جواب پر سب کے علاوہ چندر کمار بھی ہنس پڑا۔ لیکن یہ واقعہ تھا
کہ دودا چندر کمار کو بالکل اپنے لڑکے کی طرح چاہتا تھا۔

چندر کمار اٹھارہ انیس سال کا ایک خوبرو لڑکا تھا۔ احمد علوی سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ ڈو میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا بڑے امیر آدمی کا اکلوتا بیٹا تھا اور اب بھی جمشید روڈ پر اس کی ایک عالیشان کوٹھی ہے۔ کار، موٹر، سائیکل وغیرہ سب کچھ انکے پاس ہے تقسیم ہند کے بعد جب انکے والدین اور سارے رشتہ دار ہندوستان جانے لگے تو چندر کمار نے پاکستان چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کو غالباً کسی سندھی ہندو لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو کالج میں اس کی کلاس فیلو تھی اور جس کے ماں باپ اپنی عرصہ سے لگی بندھی تجارت کے باعث پاکستان سے نہیں جانا چاہتے تھے چندر کمار کے والدین جب اس کو سمجھا منا کر تھک گئے تو روتے پیٹتے بمبئی چلے گئے ان کے جانے کے بعد چندر کمار نے اپنی محبوبہ سے شادی بھی کر لی لیکن امیر اور نوعمر لڑکا ہونے کے باعث ناتجربہ کاری نے اسے بُری صُحبت میں پھنسا دیا شادی کے بعد یوں تو چندر کمار ہندوستانی ہائی کمشنر کے پرمٹ آفس میں نوکر ہو گیا تھا لیکن زندگی کے اونچے معیار اور محبت کی شادی نے اسے روپیہ کمانے کی دھن میں مبتلا کر دیا اور جرائم پیشہ دوستوں کی صحبت میں اس نے اپنی کوٹھی کے ایک خفیہ کمرے میں جعلی سکے بنانے کی مشین نصب کر دی جعلی سکے سیاست کے بازار میں تو چل سکتے ہیں!! نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن چندر کمار دھر لیا گیا۔

پتہ نہیں یہ کہانی سچ تھی یا جھوٹ۔ کیونکہ جیل میں ہر آدمی اپنے آپ کو بڑا شریف، بڑا معزز اور بڑا معصوم ظاہر کرتا ہے اسی لئے مجھے سچ مچ شریف، معزز

اور معصوم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو شریف، معزز اور معصوم ظاہر کرنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی کبھی کبھی تو ماحول کا ایسا گہرا نفسیاتی اثر مجھ پر پڑتا کہ میں یہ محسوس کرنے لگتا ہوں۔ جیسے سچ مچ مجھ سے کوئی گناہ یا کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔ بعض اوقات تو یوں ہوتا کہ اگر کسی نئے قیدی نے میرے سزائے قید کی وجہ پوچھی اور میں نے سچ سچ اپنا جرم بتانا شروع کیا تو میری زبان لڑکھڑانے لگتی۔ جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں جیسے میں نے واقعی اگر دانستہ نہیں نادانستہ ہی ضرور کوئی جرم کیا ہے۔

ماحول ـــــ ماحول کا انسانی زندگی پہ کتنا گہرا اثر پڑتا ہے جب میں ماحول کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا کہ اب تک۔ اگر میں جرم یا جرائم پیشہ نہیں تھا تو کم از کم موجودہ ماحول مجھے ضرور مجرم یا جرائم پیشہ بنا دے گا جیل کے بارے میں تو یہ سوچا کرتا تھا کہ وہاں مجرم کو اس لئے بند کیا جاتا ہوگا کہ اس کی اذیت ناکیاں اسے جرائم سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لینے پر مجبور کر دیتی ہوں گی مگر یہاں آ کر چندر کمار کو دیکھا کرتا تھا جو بیری سے ہر روز جیب تراشی کے نئے نئے طریقے سیکھا کرتا ہے تو پھر میں چپکے چپکے دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگا کرتا کہ الٰہی مجھے اس دلدل میں کنول کے پھول کی طرح صاف و شفاف رکھ۔۔!!! کہیں بیری یا محمد کا سایہ مجھے اپنی سیاہ آغوش میں نہ جھپٹ لے۔

بیری۔ محمد۔ شریف اور علی محمد جلیم میں چرس بھر کر دم لگا رہے تھے۔ مجھے

مجھے آواز دی۔

"بابو لگا ایک چرس کا دم۔ تیری آنکھیں نیند کے مارے ایک دم لال سرخ ہو رہی ہیں۔ دم لگاتے ہی کل کی طرح ایسی مجے کی نیند آئے گی کہ بس رہے بس۔"

کل کی گہری نیند کی یاد نے مجھے چرس کا ایک دم لگانے کی ترغیب ضرور دی لیکن میں گھبرایا ہوا تھا ایک تو سگریٹ کی بُری عادت نے ہی مجھے اتنا ذلیل کر دیا تھا کہ میں شرف سے بیڑیاں تک مانگ کرنے آیا تھا اب اگر چرس کی مجھے عادت پڑ گئی تو پھر شاید کنول کا پھول سر نیوڑھا کر دلدل میں ہمیشہ کیلئے گر پڑے گا۔ میں جیل سے باہر جانے کے بعد اپنی بیوی اور اپنے چھوٹے بچے اور ساری دنیا کے سامنے ایک "چرسی" کی طرح نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت صاف انکار کرنے سے مجھے یہ اندیشہ تھا کہ محمد اور دوسرے ساتھی مجھے اور مجبور کرتے۔ اس لئے میں نے بات بنا دی کہ میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔

علوی نے کہا۔

"ارے لو، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ تمہارا کھانا وہاں کھولی میں بڑی دیر سے دھرا ہوا ہے، جاؤ کھا لو۔"

میں کھولی میں گیا تو دیکھا کہ ہماری کھولی کا تیسرا ساتھی سردار اکرم داد، بھی روٹی کھا رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مٹی کی چینی میں جمی ہوئی دال اور سخت چپاتی سے دو تین نوالے کھانے کی کوشش کی۔ کھایا نہ گیا اور سگریٹ

کے ایک خالی ٹن سے پانی پی کر کھولی کے باہر آیا تو عجیب منظر پایا۔ محمد شریف خان اور بیری بڑی کڑی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں جب ان کے پاس بیٹھ گیا تو میرے پوچھنے سے پہلے ہی بیری نے کہا۔

"بابا۔ تو ابی نوا ہے۔ اس لئے ہم آج تجھے معاف کرتے ہیں لیکن آئندہ سے تو پھر کبھی سردار اکرم داد، چندر کمار اور دودا کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ تو پھر ہم تجھ سے بات نہیں کریں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں ___ ؟"

بیری نے محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لے ___ پوچھتا ہے کیوں ___ ؟ ارے بابا اکرم داد بھنگی ہے بھنگی۔ سمجھا!"

میں نے کہا۔ "نہیں وہ تو کرسچین ہے۔"

بیری نے میرا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

"ہنہ کرسچین ہے۔ بابو صاحب۔ ادھر سارے بھنگی مالے کرسچین ہو گئے ہیں۔ ابھی بہر حال ہم تجھ کو ایک بار بولتا ہے۔ اگر فر تو اس کے ساتھ روٹی کھائے گا تو فر ادھر اپن کے پاس آنے کی جرورت نہیں۔"

میں نے بیری کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"بیری ___ دیکھو یہ غلط بات ہے۔ ہم سب انسان برابر برابر ہیں۔

کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا ہے۔ کاش میں تمہیں سمجھا سکتا کہ انسان کس طرح بھنگی بنتا ہے۔ اور کیوں بھنگی بنتا ہے۔"

بیری بولا۔

"ابی سالا۔ ہم ادھر تیری تکریر سننے نہیں بیٹھا ہے۔ ابھی ہمارے پاس بل منگ ہے۔ ہم بھی کھوب سمجھتا ہے کہ انسان بھنگی کس طرح بنتا ہے بس ہم بولتا ہے تیرے کو۔ وری فیر بھی تو سمردار ہے۔ چندریا دودا کے ساتھ روٹی کھائے گا تو فیر ہم تیرے ساتھ بائیکوٹ کریں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"چندر اور دودا تو بھنگی نہیں ہیں۔"

میرے سوال کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ میرا دل ہی میرے سوال کا جواب دے رہا تھا کہ اسلام کی صحیح تعلیمات کو کتنا مسخ کر کے رکھ دیا گیا ہے یہ لوگ جو چور ہیں۔ ڈاکو ہیں۔ زانی ہیں۔ اخلاق کے قاتل ہیں انہیں چوری کرتے، ڈاکہ ڈالتے، زنا کرتے، اخلاق کو قتل کرتے وقت کبھی اسلام یاد نہیں آتا۔ ان کی نظر میں اسلام صرف اتنا ہے کہ کرسچین یا ہندو کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہ کھاؤ۔ اسلام دنیا کے کسی انسان سے نفرت کا درس نہیں دیتا اسلام کی نظر میں تو نہ کوئی بھنگی ہے اور نہ کوئی اعلیٰ ذات کا انسان۔ لیکن پچھلے ڈیڑھ سو سال میں برطانوی ڈاکوؤں نے جو سوداگروں میں ہمارے

وطن آئے تھے۔ جہاں ہمارے وطن کی ایک ایک چیز اجاڑ دی وہاں ہمارے مذاہب کے بھی حلیئے بگاڑ دیئے۔ آج میں شلوار اور شیروانی پہننے کو اسلام سمجھتا ہوں اور بیری ہندو اور کرسچین سے نفرت کرنے کو اسلام سمجھتا ہے۔

انگریز حاکموں اور ہمارے قومی رہنماؤں نے بیری اور شریف خان کو جس اسلام کی تعلیم دی ہے وہ اسلام اس اسلام سے بالکل مختلف ہے جو قرآنِ پاک کے ذریعے زمین پر انسانوں کے لئے اتارا گیا۔

میرے خیالات نیلگوں آسمان کی گہرائیوں میں اوپر ہی اوپر اڑتی ہوئی چیلوں کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہے تھے کہ اچانک بے ہنگم قہقہوں کے شور نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک قیدی، جو قدیم یونان کے اولمپک ہیرو کی طرح قوی ہیکل تھا اور جسے جیل کے سارے قیدی "پہلوان" کے نام سے پکارتے تھے اپنے دونوں ہاتھوں کے بل پر بالکل الٹا ہو گیا ہے اس کے پاؤں چھت کی طرف اٹھے ہوئے ہیں اور منہ زمین کی طرف اپنے ہاتھوں سے اسی طرح چلتا ہوا میری طرف آ رہا ہے جس طرح ہم اپنے آپ پیروں سے چلتے ہیں۔ میرے قریب آ کر اس نے کہا۔

"بابو ابراہیم صاحب تیری خیر ہووے۔ تینوں شاکر بابو نے سلام آکھیا اے ہور کیا ہے کہ اوہ تینوں ملن دے واسطے ہنی ایتھے آوندا پیا اے۔"

یہ کہہ کر وہ اسی طرح الٹا ہاتھوں کے بل چلتا ہوا لوٹ گیا۔ مجھے اسکی

اس حرکت پر بڑی ہنسی آئی ۔ لیکن میں نے اپنے دماغ پر زور دے کر سوچنا شروع کیا کہ یہ شاکر بابو کون ہے؟ اس نام کا تو میرا کوئی دوست نہیں ہے!!!

ابھی میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بے حد دبلا پتلا لڑکا جس کی آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک چڑھی ہوئی ہے اور جس نے اودے رنگ کی قمیص اور اجلی سفید شلوار پہنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ایک اور عینک پوش سیاہ رنگ سیاہ پتلون اور سیاہ قمیض والا نوجوان تھا میرے پاس آئے شریف شاکر نے کہا۔

"جلیس صاحب میرا نام شریف شاکر ہے میں کوئی ادیب تو نہیں ہوں لیکن ادب سے مجھے گہری دلچسپی ہے میں آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں نے آپ کے افسانوں کی پہلی کتاب پڑھی تھی۔ آپ کے اور میرے تعارف کے لئے میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے دو گہرے دوستوں مشہور شاعر احمد راہی اور مشہور افسانہ نگار اے حمید کا جگری دوست ہوں۔ ہم تینوں امرتسر میں پیدا ہوئے سارا بچپن اور لڑکپن ایک ہی ساتھ گزارا ہے۔"

میں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"اچھا۔ آپ اے حمید اور احمد راہی کے دوست ہیں تب تو پھر میرے اور آپ کے درمیان مزید تعارف کی کوئی ضرورت نہیں۔ آئیے نا بیٹھئے......"

شاکر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ساتھی عینک پوش بلکہ سیاہ پوش انسان

سے میرا تعارف کرایا۔

"یہ ہیں مسٹر......"

نام میں بھول گیا اور بھولنے کی وجہ بھی معقول تھی کیونکہ جیل کا ہر قیدی اسے P.P کے نام سے یاد کرتا تھا۔ پی پی کا لفظ پبلک پراسیکیوٹر کا مخفف ہے شاکر نے مجھے بتایا کہ اسے P.P اس لئے کہا جاتا ہے کہ جیل میں قیدیوں کی بھی اپنی ایک عدالت ہوتی ہے۔ وہ اپنی تاریخ پیشی سے ایک دن قبل جیل میں عدالت کا اجلاس منعقد کرتے ہیں۔ باقاعدہ ایک جج مقرر ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے قیدی وکیل بنتے ہیں۔ کل اصلی عدالت میں جو مقدمہ پیش ہونے والا ہوتا ہے اس کا ریہرسل جیل میں ہوتا ہے تاکہ قیدی جب اصلی عدالت میں پیش ہو تو اپنی صفائی پیش کرتے وقت پوری طرح تیار ہو۔ اس Mock Court میں یہ مسٹر سیاہ پوش ہمیشہ P.P بنائے جاتے ہیں اور P.P کے نام سے مشہور ہیں۔

P.P کے تعارف کے بعد P.P نے بھی شاکر کے مزید تعارف کی ضرورت محسوس کی اور بولا۔

"جلیس صاحب۔ میں اور شاکر بابو یہاں کے ایک دفتر میں کام کرتے تھے وہاں کسی معاملہ میں افسر کی جعلی دستخطوں کا پھڈا بنایا گیا۔ شبہ ہم دونوں پر کیا گیا کہ جعلی دستخط ہم دونوں نے بنائے ہیں اس لئے پچھلے اٹھارہ ماہ سے جیل کے اندر ہیں۔ شریف بابو چونکہ دفتری مراسلت اور ٹائپ کا کام جانتا ہے۔

اس لئے اس کو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے "مہاڑی منشی" بنایا ہے۔ اس کا سپرنٹنڈنٹ

اور جیلروں پر بڑا اثر ہے۔ آپ کو کوئی ضرورت ہو تو یہ آپ کی ضرورت پوری کر

سکتا ہے!!"

میں نے جواب دیا۔

"مجھے سگریٹ کے سوائے کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔

"پہلوان" بھی اسوقت تک وہاں آچکا تھا۔ اپنے چوڑے چکلے اور

مضبوط سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"بابو ابراہیم صاحب۔ غم نہ کر۔ جب تک اپنا شاکر بابو مہاڑی منشی

ہے ــــ تیرے لئے ادھر سگریٹ کا کارخانہ کھول دے گا"۔

میں نے مسکراتے ہوئے شاکر سے پوچھا۔

"اچھا آپ کے پاس کچھ کتابیں وغیرہ ہیں ــــ؟"

اس نے کہا۔

"سویرا کا خاص نمبر اور شاہراہ کے دو پرچے ہیں۔ میں پہلوان کے ذریعے

ابھی آپ کو بھجوا دوں گا"۔

میں نے کہا۔

"آپ کون سے بارک میں ہیں چلئے میں وہاں چلتا ہوں"۔

شاکر ہنس پڑا اور بولا۔

"میں بارک نمبر ۲ میں ہوں۔ لیکن آپ وہاں نہیں جا سکتے۔ غالباً آپ کو

نہیں معلوم کہ جیل میں بھی آوارہ گردی ایک جرم ہے یہاں بھی دفعہ ۱۰۹ کا نفاذ

ہے۔ اگر آپ ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ میں بغیر اجازت چلے جائیں تو

ایک روز کے لئے کھولی بند کر دیا جاتا ہے!"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو پھر اس جیل کی کیا ضرورت ہے جبکہ باہر سے سارے قانون یہاں

نافذ ہیں۔ قانون کی خلاف ورزی کی روک تھام کے لئے قید کی سزا دی جاتی ہے

اور اگر قید میں بھی قانون کی خلاف ورزیاں جاری رہیں تو پھر اس جیل کا کیا

مطلب۔!"

شاکر نے جواب دیا۔

"بلبجی صاحب! یہ نوکر شاہی کی جیل ہے۔ سمجھے آپ۔ جہاں قانون

صرف برائے قانون اور جیل محض برائے جیل ہوتی ہے۔ یہ اس لئے نہیں بنائی

گئی ہے کہ یہاں آکر مجرم کو جرم سے خوف آئے یا وہ قانون شکنی سے باز رہے بلکہ

یہ تو ایک روایت ہے کہ کسی نے قانون شکنی کی اور جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں تو محض

روایتاً کسی مجرم کو جیل بھیجا جاتا ہے۔ قانون کے موجودہ محافظ کسی کو جیل بھیجتے

وقت کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس کو جیل بھیجنے کا قطعی مقصد کیا ہے۔ لیکن چونکہ

مجرم کو جیل بھیجنے کا ایک بڑا پرانا طریقہ ہے اس لئے طریقہ کی پابندی اندھا دھند

طریقے پر کی جا رہی ہے:

ابھی ہماری باتیں ہو رہی تھیں۔ اور ابھی صرف ساڑھے تین بجے کا وقت تھا لیکن سپاہی بے شمار چابیوں کا گچھا ہلاتا ہوا آیا اور بولا۔

"چلو رے چلو ـــــ اپنی اپنی کھولی پکڑو۔"

کھولیوں میں بند ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ شریف شاکر نے رسالہ بھی بھجوانے کا وعدہ کیا اور ہم نے اپنے اپنے کمبل اٹھا لئے۔

اس وقت ایک اور جھگڑا اٹھ کھڑا ہو گیا۔ مقدم درجان بلوچی چندر کمار سے کہہ رہا تھا۔

"چل آج میں تجھے "ہینڈل" میں بند کروں گا۔"

"ہینڈل" لوہے کی سلاخوں کا بنا ہوا ایک لمبا سا برآمدہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ریلوے اسٹیشن کا تھرڈ کلاس ویٹنگ روم!

لیکن چندر کمار اپنی جگہ پر اڑا ہوا تھا۔ کہ نہیں میں تو ادھر کھولی میں بند ہوں گا۔ میں رونددوا کے ساتھ بند کیا جاتا ہوں۔ ہم ہندو ہیں۔ گورنمنٹ نے ہندوؤں کو الگ بند کرنے کا حکم دیا ہے۔

لیکن درجان بلوچی کہہ رہا تھا۔

"چل تیری ایسی تیسی۔ ادھر سالا جیل میں کیا ہندو مسلمان کا بات کرتا ہے ـــــ چل ہینڈل میں!"

محمد مکرانی اور شریف خان بڑی شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس منظر کو دیکھ رہے۔ میں نے شریف خان سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ "عرصہ سے درجان کی طبیعت چندر کمار پر آئی ہوئی ہے اس لئے اس کو وہ ہینڈل میں لے جانا چاہتا ہے۔ کیونکہ ہینڈل میں آج رات درجان ہی کا پہرہ ہے۔"

چندر کمار شاید اس بات کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں جمعدار سے۔ صوبیدار سے۔ جیلر صاحب سے بولوں گا ـــــ ہم ہندو ہیں ـــــ"

پھر مجھے متوجہ کر کے چندر کمار نے کہا۔

"لک مسٹر جلیس۔ وی آر مائنورٹی ـــــ اینڈ ـــــ اینڈ ـــــ وی ہیو بن آرڈر بائی دی گورنمنٹ ٹو بی کیپٹ سپیریٹلی فرام اَدر کمیونیٹیز!"

اسی اثناء میں جیل جمعدار اندر آیا۔ اور اس نے درجان سے کہا۔

"نہیں رے نہیں ـــــ اس کو الگ کھولی میں بند کرو۔ ان کے واسطے الگ حکم ہے۔ گورنمنٹ کا آرڈر ہے بے گورنمنٹ کا۔"

چندر کمار کی عزت بچ گئی۔ محمد مکرانی کا خیال تھا کہ اچھا ہی ہے کہ چندر کمار کو سگریٹ بیڑی کی طلب نہیں۔ ورنہ درجان تو یوں فٹافٹ معاملہ بنا لیتا۔"

کھولی میں بند ہوتے وقت میں نے علوی سے کہا۔

"علوی یار۔ یہ جیل تو مجھے کچھ کچھ باہر کی دنیا کا ایک آئینہ معلوم ہوتا ہے
ذات پات کے جھگڑوں اور اقلیت واکثریت کے تنازعوں کے علاوہ یہاں
تو جنسی بے راہ روی کے وہ سارے جرائم پرورش پاتے ہیں جن کی پاداش
میں یہاں جھونکا جاتا ہے۔"

علوی نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

"مجھے امریکہ کے مشہور ترقی پسند ناول نگار ہاورڈ فاسٹ کا ایک جملہ
بہت یاد آتا ہے۔ اسے جب جیل لے جایا جا رہا تھا تو اس نے اپنے ساتھیوں
سے کہا تھا کہ مجھے جیل جانے کا کوئی غم نہیں۔ کیونکہ میں ایک بڑی جیل سے
نکل کر چھوٹی جیل میں جا رہا ہوں ــــــ"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آؤ تو پھر کھولی میں جا کر ہم چھوٹی جیل کی ایک اور چھوٹی جیل میں
داخل ہو جائیں۔"

یہ کہتے ہوئے ہم دونوں کھولی میں داخل ہو گئے۔ سردار اکرم داد پہلے ہی
کھولی کے اندر لیٹا ہوا تھا۔

سپاہی نے باہر سے تالا لگا دیا۔

(۵)

پھر رات آئی ــــــ نہیں رات نہیں اندھیرا آیا۔ رات تو فاطمہ کی لمبی
لمبی کالی کالی زلفوں کا نام ہے رات تو خود فاطمہ کا نام ہے۔ وہ رات جو فاطمہ ہے۔ وہ
یہاں کیسے آسکتی ہے!

سرِ شام ہی قیدیوں کی ساری بارک قرآن مجید کی آیتوں سے گونج رہی تھی۔ ہر
قیدی، حتیٰ کہ احمد علوی تک بستر پر بیٹھے بلند آواز سے تلاوت کلامِ پاک کر رہا تھا۔
جیل میں خدا بہت یاد آتا ہے خدا مسجد میں بھی شاید اتنا یاد نہ آتا ہو۔ جتنا کہ جیل میں
یاد آتا ہے۔ بڑے بڑے قاتل، چور، ڈاکو، بدمعاش جیل میں اتنے متقی بن جاتے
ہیں کہ کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے لگتا کہ پاکستان کو اسلامی ملک بنانے سے پہلے سارے
پاکستانیوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانا ہے تو ان سب کو جیلوں میں ٹھونس دینا

چاہیئے۔ موجودہ حالت میں انہیں نہ تو مولوی مسلمان بنا سکتا ہے اور نہ وزیراعظم
یہ نہ کسی مذہبی درسگاہ میں اسلام کی تعلیمات سے روشناس ہو سکتے ہیں اور نہ
مسجد میں!

مگر فکر و خیال کی آزادی کے ساتھ ساتھ میرا یہ لمحۂ فکر یہ بھی محبوس تھا۔

ہماری کھولی کے ایک طرف شریف خان بلند آواز سے سورۂ یٰسین پڑھ رہا
تھا۔ اور دوسری طرف چندر کمار گیتا کا پاٹ کر رہا تھا اور میں انسان کی فطرت
کے اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ انسان بھی کتنا معصوم ہوتا ہے۔ گناہ کے بعد توبہ کرنے
اور جرم و سزا کے بعد خدا سے لو لگانے کی اسکی یہ عادت کیسی پیاری سادہ ہوتی ہے!

جب اندھیرا گہرا ہو گیا۔ تو شاید سب قیدیوں نے کلامِ پاک بند کر کے چوم
کر اور اپنے سینوں پر پھونک کر دروازوں کے اوپر رکھ دیا۔ ماحول پر ایک دو
لمحے کے لئے شاید سکوت طاری ہوا اور پھر اچانک کسی کھولی سے "ٹیٹ مارنے"
کی آواز آئی۔

"پھُر پھُر پھُر ررررر"!

ٹیٹ کی آواز گونجتے ہی یٰسین پاگل ہو گیا اور اس کے منہ سے اگلنے والی
گندی گندی گالیوں نے ٹیٹ بجانے والے کی ماں، بہن، بیٹی کو ننگا اور بے آبرو
کرنا شروع کر دیا۔ ہر گالی کے پیچھے قہقہوں کا ایک ہجوم دوڑ پڑتا اور گالیوں اور
قہقہوں میں بڑی دیر تک آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ یٰسین دیواروں سے

دھنا دھن سر ٹکرانے لگا جس کے ایک دھماکے سے ساری بارک گونج اٹھتی تھی۔

مجھے یٰسین پر بڑا رحم آیا۔ میں نے بیری کو آواز دی۔

"بیری ــــ یٰسین بیچارہ مر جائے گا۔ اسے کیوں تنگ کرتے ہو۔ جو
بھی ٹیٹ مار رہا ہے اسے روکو ــــ مذاق حد سے نہیں بڑھنا چاہیئے۔

بیری نے میری بات مان لی۔ وہ چونکہ جیل کا یا ترغنڈہ تھا۔ اس لئے اس
نے زور سے آواز لگائی۔

"سنو رے سنو۔ ورری اگر پھر کوئی ٹیٹ مارے گا اور ہم آواج پہچان لیں گا
تو ہم صبوں کو اس کی ہڈی توڑ دیں گا۔"

بیری کی اس آواز کے ساتھ ہی سناٹا چھا گیا۔ جیل پر شاید سپرنٹنڈنٹ اور
جیل کے انسپکٹر جنرل کا اتنا رعب نہیں ہو گا۔ جتنا کہ بیری، علی محمد، شریف خان
اور محمد منگل کا تھا۔ قیدی تو خیر ان سے ڈرتے ہی تھے لیکن سپاہی بھی ان سے بُری
طرح خوفزدہ تھے۔ ان لوگوں نے اندر دو تین بار سپاہیوں کو بھی خوب پیٹا تھا یہی
وجہ تھی۔ سپاہی انہیں چرس، بیڑی اور دوسری سہولتیں دیا کرتے تھے چنانچہ
۲۵ کھولیوں کی اس لمبی بارک کے لئے جو لالٹین ملتی تھی۔ وہ سپاہی اس کھولی
کے سامنے رکھتے تھے جس میں بیری۔ علی محمد۔ شریف اور محمد بند ہوتے تھے۔
تاکہ انہیں اس کے اجالے میں تاش کھیلنے کی آسانی ہو۔

جب کافی دیر تک گہرا سناٹا طاری ہو گیا تو پھر وحشت ہونے لگی میرا جی

چاہنے لگا کہ پھر کوئی ٹیٹ مارے۔ پھر پھر پھُر ررر...... اور یٰسین کے منہ سے غلیظ
گالیوں کا مغلظ لاوا پھوٹ پڑے۔ پھر قہقہے گالیوں کے تعاقب میں دوڑ پڑیں۔
اور گالیوں اور قہقہوں کی اس دھماچوکڑی میں میں بالکل بھول جاؤں کہ یہ رات
ہے۔ یہ بھیانک اندھیرا ہے۔ میں سیفٹی ایکٹ کا زخمی ہوں اور یہ قید خانہ ہے
یٰسین دیواروں سے سر ٹکرا کر مرتا ہے تو مر جائے۔ کیا کروں کہ قید اتنی سخت نہیں
جتنا کہ احساسِ قید سخت ہے۔ رات اتنی بھیانک نہیں۔ جتنی کہ اس رات سے
لپٹی ہوئی یاد بھیانک ہے۔!

میں نے علوی سے کہا۔

"یار علوی ـــــ یارانِ قفس کو اذانِ ہنگامہ دو۔ یہ سکوت مہلک بیماریوں
کا کیڑا بن کر خون میں داخل ہو رہا ہے اگر کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم ٹیٹ ہی مارو تا کہ
مغلظ گالیوں اور گرجدار قہقہوں سے یہ سقف و بام اڑ جائیں اور یہ محسوس ہوتا رہے
کہ رات گذرنے والی ہے!"

علوی نے ٹیٹ مارنے کی بجائے جیل کے "سہگل" رمضان کو آواز دی۔
رمضان نہ جانے کس کھولی میں بند تھا۔ کافی دور سے اس کا جواب آیا علوی نے کہا۔

"یار رمضان ـــــ طبیعت بڑی گھبرا رہی ہے۔ بس کوئی بھڑکدار چیز سنا دو۔"

اس فرمائش کو ہر کھولی سے بڑی پرجوش تائید ملی۔ اور رمضان نے کھنکار
کر گلا صاف کیا اور میٹھی لے اور فلمی طرز میں گانا شروع کیا۔

جن راتوں میں نیند اُڑ جاتی ہے کیا قہر کی راتیں ہوتی ہیں
دروازوں سے ٹکرا جاتا ہوں دیواروں سے باتیں ہوتی ہیں
گھر گھر کے جو بادل آتے ہیں بن برسے ہی رک جاتے ہیں
آشاؤں کی جھوٹی دنیا میں بھیگی برساتیں ہوتی ہیں
جب تم نہیں ہوتے پہلو میں۔ اور لمبی راتیں ہوتی ہیں
تنہائی سے جی گھبراتا ہے۔ اور دل سے باتیں ہوتی ہیں
جن راتوں میں نیند اُڑ......

رمضان کا یہ گیت اپنے پیچھے ایک کربناک سناٹا چھوڑ گیا یہ گیت ہر کھولی
میں، ہر قیدی کے سامنے لاتعداد یادوں کا انبار پھینک کر چلا گیا تھا اور ہر قیدی
چپ چاپ بیٹھا یادوں کے انبار کو کرید رہا تھا۔

میری روح، میرا جسم چھوڑ کر فریئر روڈ پہنچ گئی تھی۔ رات بہت آہستہ
آہستہ رینگ رہی تھی۔ نہ جانے کب آنکھوں پر پلکیں ڈھلک گئیں۔ اور قہر کی رات
کب ختم ہوئی۔

صبح نہانے کے بعد علوی اپنی پتلون تلاش کرنے لگا اور جب تلاش کرتے کرتے
تھک گیا تو سردارہ اکرم داد سے ذرا تلخ لہجے میں بولا۔

"سردارے، یہ بہت بُری بات ہے کہ میری پتلون چوری ہوگئی۔ لفظ "چوری"
پر میں چونکا ـــــ چوری تو ہمیشہ جیل کے باہر ہوتی ہے۔ اور چوری کی پاداش میں آدمی

کو جیل میں جھونکا جاتا ہے۔ مگر اب جیل میں بھی چوری ہو تو پھر اسے کہاں بھیجا جائیگا جیل کے آگے اور کون سا مقامِ تعزیر ہے۔۔؟ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انسان کو کبھی قید نہیں کیا جاسکتا شاید انسان کو قید میں بھی قید رکھنا بہت مشکل ہے۔ میں انسان کی اسی آزاد فطرت اور باغی روح کا شیدائی ہوں. جو اپنے سامنے ہر حد کو ٹھوکر سے مٹا دیتا ہے۔ جو اس کو جکڑنے والی ہر قید کو ڈھا دیتا ہے۔

سردار اکرم داد یسوع مسیح کی قسمیں کھا کر کہہ رہا تھا۔

"علوی صاحب' ہم شریف آدمی ہیں۔ یہ کوئی مسخری کی بات نہیں ہم نے نہیں چرایا ہم کرسچین ہے ہم ذلیل آدمی نہیں ہے۔ ہمارا لیڈی فلاں انگریز بہادر کے بچوں کی نرس ہے"۔

اچانک سامنے سے مجھے ایک کانا ایک چشم کالا چیچک رُو بیحد بدصورت قیدی نظر آیا جس نے علوی کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ میں نے علوی کی وہ پتلون بارہا دیکھی تھی۔ اس لئے میں نے علوی کو متوجہ کیا۔

"علوی ___ دیکھو ___ وہ تمہاری پتلون نہیں؟"

علوی نے دیکھا اور پہچان لیا ___ علوی۔ بری اور شریف خان دوڑ کر اس کے پاس پہنچے اور اسے پکڑ لیا۔ بری نے پوچھا۔

"دری سالے بول تونے یہ پتلون کہاں سے لی ہے؟"

اس نے کہا۔

"کیوں ___ کسی کی دھونس ہے۔ یہ میری ہے!"

شریف خاں نے کہا۔

"یہ تو ایک ہی چانٹے سے پتہ چل جائے گا کہ یہ کس کی ہے۔ مان جا یا بول سیدھی طرح ....!"

یہ کہہ کر شریف خاں نے اسے ایک زوردار چانٹا رسید کیا چانٹا پڑتے ہی وہ قیدی شریف خاں پر حملہ کرنے کیلئے بڑھا ہی تھا کہ بری نے طاقتور ہاتھ سے اسکی گردن پکڑ لی۔ اب قیدی خاموش ہوگیا اور بولا۔

"میں نے چار بیڑیاں دیکر یہ پتلون حنیف سے خریدی ہے۔ آؤ چلو میں حنیف سے پُچھوا دوں"۔

وہ ہم سب کو لیکر حنیف کے پاس گیا۔ حنیف حوض کے چبوترے پر بیٹھا دوسرے قیدی سے اپنے سر کی جوئیں نکلوا رہا تھا۔ حنیف نے فوراً جرم کا اقرار کرلیا اور بولا۔

مجھے بیڑی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ قسم خدا کی دو روز سے میں نے بیڑی کا ایک کش بھی نہیں لگایا تھا۔ اس سالے شکور کے پاس سات بیڑیاں تھیں میں نے اس سے بیڑی مانگی تو اس نے جواب دیا مجھے تو کہیں سے ایک پاجامہ یا پتلون لادے۔ میں ایک کے بجائے تجھے چار بیڑیاں لادوں گا"۔

پھر اس نے علوی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ لاٹ صاحب ہمیشہ کھڑکی میں اپنے کپڑے پھینک کر باہر پھرتے رہتے تھے

میں نے کہا لاؤ ذرا لاٹ صاحب ہی کو چرکا دے دوں۔"

معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی گئی لیکن شکور کہہ رہا تھا۔ بابو صاحب میں ایک شرط پر یہ پتلون واپس کروں گا جبکہ مجھے صابن کا ایک ٹکڑا دیا جائے۔

بیری اور شریف خان اس سودے پر [illegible] نہیں تھے۔ لیکن علوی نے کہا۔

"آؤ میں تمہیں صابن کا ایک ٹکڑا دے دوں۔"

جب ہم اپنی کھولیوں کی طرف لوٹنے لگے تو مجھے ہر دم یہ احساس ہو رہا تھا کہ آیا یہ جیل ہے یا عہد ماضی کا ایک میوزیم۔ جہاں انسان بکری [illegible] خرید رہا ہے بارٹر کے طریقہ، خرید و فروخت کے بارے میں میں نے پرانی تاریخوں اور معاشیات کی کتابوں میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ لیکن جیل کی بدولت میں نے اسے عملی طور پر اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ مجھے بے اندازہ خوشی ہوئی کہ دنیا کی تاریخ میں دو بڑے عہد، ماضی اور حال ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے میری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہیں۔

لیکن جب پھر بھی اپنی یادوں میں کھو گیا تو مجھے صرف یہی محسوس ہونے لگا کہ جیل انسان کو صرف ماضی کی طرف لے جاتی ہے۔ جیل انسان کو آگے نہیں بڑھاتی بلکہ پیچھے دھکیلتی ہے۔

جیل صرف ایک ماضی ہے!

(۶)

ناشتے کے بعد پھر سگریٹ کی طلب بے طرح محسوس ہونے لگی۔ میں نے یوں ہی مذاقاً محمد مکرانی سے کہا۔

"یار محمد [illegible] تم میرا سینہ چیر کر میرا دل نکالو اور اس کو بیچ کر ایک سگریٹ لا دو۔ میرے پاس [illegible] کپڑوں کے علاوہ نہ کوئی کپڑا ہے اور نہ صابن کہ میں "بارٹرنگ" کروں۔"

محمد ہنس پڑا اور بولا:

"لاؤ تمہارا دل دے دو ہم تم کو اس معاوضے میں برکت علی دوں گا۔"

میں نے کہا۔

"یار برکت علی نہیں چاہیئے۔ سگریٹ چاہیئے سگریٹ۔"

محمد نے کہا۔

"ہاں، میں وہی تو تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے کھولی میں لے گیا اور ایک پٹاری سی نکالی۔ جس کے اندر ایک سگریٹ تھا۔ میلا کچیلا سا بر کلے کا سگریٹ۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں سمجھ گیا اور بولا۔

"اچھا تو گویا بر کلے کا پاکستانی نام برکت علی ہے! خوب! خوب!" اس کے بعد میں احمد علوی اور برکت تینوں کھولی کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گئے ابھی برکت علی نے مجھے اور علوی کو دو دو کش بھی نہ دیئے ہوں گے کہ جمعدار مہر شاہ دو سپاہیوں اور ایک وارڈن کے ساتھ بارک کے برآمدے میں آیا اور بولا۔

"اپنی اپنی کھولیوں سے سامان اور بسترے باہر نکالو۔ سپیڈنٹ صاحب راؤنڈ پر آنے والا ہے۔"

برکت علی کے ننھے سے جسم سے آخری سانس کھینچ کر ہم باہر نکلے۔ دیکھا کہ بارک کے سامنے صحن میں سارے قیدیوں نے ایک لائن میں بسترے کھول کر بچھا دیئے ہیں اس کے آگے پانی کے گھڑوں اور جنبیوں کی قطار ہے اور اس کے آگے جوتوں کی قطار۔ میں نے علوی سے پوچھا۔

"یہ کیا ماجرا ہے ــــــ؟"

علوی نے جواب دیا۔ "بستروں، گھڑوں، جوتوں اور قیدیوں کی

صف آرائی سپرنٹنڈنٹ کو گارڈ آف آنر دینے کیلئے کی گئی ہے۔ اچھا تو پھر بوٹ آتار دو۔"

میں نے کہا۔

"کیوں۔ میں نہیں آتاروں گا۔"

شریف خان اور بری نے مجھے بتایا کہ ضد نہ کرو۔ یہ جیل کا قاعدہ ہے سپیڈنٹ بہادر جیل کا شہنشاہ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے اس کی رعایا ننگے پاؤں کھڑی ہوتی ہے جب احمد علوی نے بھی جوتے آتار دیئے تو میں نے بھی ناچار جوتے آتار کر شامل قطار پاداش کر دیئے اور بارک کی دیوار کے ساتھ چونے کی لکیر سے پاؤں کے انگوٹھے ملا کر میں بھی سارے قیدیوں کے ساتھ اکڑوں بیٹھ گیا۔ کیونکہ سپیڈنٹ صاحب بہادر کی سواری کے وقت کسی قیدی کو کھڑا ہونے کی اجازت نہیں ہے میں نے علوی سے کہا۔

"چلو یہ کوئی خاص بات نہیں۔ مگر یہ جوتے پہننے کی ممانعت میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

علوی نے کہا۔

"وجہ مجھے بھی نہیں معلوم تھی لیکن مجھے بری نے بتایا کہ جن دنوں سپرنٹنڈنٹ صاحب کی سواری کے وقت قیدیوں کو جوتے پہننے کی اجازت تھی۔ ان دنوں شاید کسی سر پھرے قیدی نے کسی بات پر بگڑ کر پاؤں سے جوتا نکال کر کسی سپرنٹنڈنٹ

بہادر کی مرمت کر دی تھی۔"

میں نے علوی سے پوچھا۔

یہ کیا بات ہے کہ علوی کہ دنیا کی تاریخ میں نیرو جیسے ظالم بادشاہ سے لے کر کراچی جیل کے سپرنٹنڈنٹ تک جھوٹا اقتدار جوتے کیوں کھاتا رہا ہے اس واقع سے جو تم نے مجھے سنایا اور تاریخ کے پچھلے سارے واقعات سے صرف یہی ایک نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن محکومی، غلامی اور جھوٹے اقتدار کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

علوی نے کہا۔

لیکن اس وقت تو یہ تیز دھوپ ناقابلِ برداشت ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے دھوپ میں تپ رہے ہیں۔!

ایک بوڑھے قیدی نے آسمان کی طرف اپنی میلی میلی آنکھیں اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

"بابا ــــ ہم قیدی ہیں ہمارے ساتھ جو بھی کیا جائے وہ تھوڑا ہے۔"

اس قیدی کی آواز میں بڑا درد تھا۔ اس کا لہجہ بڑا یاس آگیں تھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو۔ ہم کس کے قیدی ہیں؟ ہم کیوں قیدی ہیں؟ انسان کیوں قیدی بنتا ہے۔؟ اور پھر ان سوالات کے علاوہ ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس دنیا میں کوئی انسان آزاد ہے؟

انسان جب پہلے پہل اس دنیا میں آیا تو یقیناً آزاد آیا تھا۔ وہ آج بھی بطنِ مادر سے آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہی انسان ہماری اس دنیا میں داخل ہوتا ہے آسمانی فضاؤں پر چاندی کا سکہ آٹھواں آسمان بن کر پھیلا ہوا ہے تو وہ قید ہو جاتا ہے۔ چاندی کے سکے والے آٹھویں آسمان کے سائے میں بیٹھ کر آباد ہے اس میں انسان صرف گنتی کے معدودے چند انسان نما جانوروں کے قیدی ہیں۔ کیونکہ یہ آٹھواں آسمان ان کے پیروں تلے زمین بنا ہوا ہے اور اس آسمانی زمین کے نیچے مٹی کی زمین پر رہنے والے ان گنت لاتعداد انسان سونے اور چاندی کی سلاخوں اور زنجیروں کی بہت بڑی بہت وسیع و عریض دنیا میں قید ہیں اور اس طرح دنیا دو قید خانوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک چاندی کی اینٹوں اور سونے کی سلاخوں والا قید خانہ ہے اور دوسرا لوہے کی سلاخوں اور پتھروں کی دیواروں والا قید خانہ ہے۔ اور دوسرا لوہے کی سلاخوں اور پتھروں کی دیوارو والا قید خانہ ہے۔

اچانک۔ فرر فرر فرر سیٹیاں بجیں۔ اور میں اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر تشریف لا رہے ہیں۔ سارے بارک پر ہیبت ناک خاموشی طاری ہو گئی۔

ہمارے وارڈ کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ اسلامی ملک کی پاکستانی جیل کا اینگلو انڈین سپرنٹنڈنٹ اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک سپاہی

چھتری پکڑے سپرنٹنڈنٹ صاحب پر سایہ ڈالنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔
ان کے پیچھے چاروں جیلر بڑے طمطراق سے قدم اٹھاتے چل رہے تھے اور پھر
ان کے پیچھے صوبیدار، جمعدار اور سپاہی بڑے ادب سے چلے آ رہے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب قیدیوں کی قطار کے پاس آئے۔ جس قیدی کے
سامنے آجاتے وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور صاحب بہادر پوچھتے۔

"ویل ٹم کو کیا تکلیف ہے؟"

قیدی کہتا۔

"حضور ـــــ مجھے اپنی بیوی بچوں سے مہینے میں دو بار ملنے کی اجازت
دی جائے کیونکہ باہر ان کا میرے سوا کوئی نہیں ـــــ ہم مہاجر ہیں حضور!"

صاحب بہادر جیل کے افسر اعلیٰ ہونے کے باوجود جیل کے قواعد سے
واقف نہیں۔ اس لئے وہ سینئر جیلر سے پوچھتے ہیں۔

"ویل۔ کیا ہم اس کو اجازت ڈے سکتا ہے؟"

سینئر جیلر جواب دیتا ہے۔

"نہیں سر، مہینے میں صرف ایک بار ملاقات کی اجازت ہے ـــــ!"

صاحب بہادر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

وہ قیدی چیختا ہی رہتا ہے لیکن سپاہی اسے زبردستی بٹھا دیتے ہیں۔

دوسرا قیدی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے۔

"صاحب ایک پوسٹ کارڈ چاہیئے۔"

صاحب بہادر حکم دیتے ہیں۔

"گیو ہِم اے پوسٹ کارڈ۔"

پیچھے کھڑا ہوا ایک قیدی منشی اس کو پوسٹ کارڈ دیتا ہے۔

اس طرح پوسٹ کارڈ لفافے عرضی کے کاغذ تقسیم کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ
صاحب بہادر میرے پاس آئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ
ڈالے ہی تھے کہ پیچھے سے صوبیدار نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر زبردستی باہر
نکال دیئے۔ مجھے بڑا غصہ آیا لیکن صوبیدار نے چپکے سے یہ کہا۔

"معاف کرنا جیل کا طریقہ یہی ہے۔"

میں خاموش ہو رہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"ویل ٹم کیا مانگتا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

میں ایک سیاسی قیدی ہوں اور مجھے عام اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رکھا
گیا ہے۔ خیر مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں۔ کم از کم مجھے وہ ساری رعایتیں ملنی
چاہئیں جو ایک سیفٹی قیدی کو دی جاتی ہیں۔

صاحب بہادر نے کہا۔

"ہم اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا۔

"تو کم از کم مجھے اخبار پڑھنے کی اجازت دی جائے اور میرے نام پر "امروز" جاری کرادیا جائے۔

سنیئر جیلر نے کہا۔

"امروز جیل کے لئے منظور شدہ اخبار نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر "جنگ" یا "انجام" جاری کرادیجیے۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب انہوں نے یہ جواب دیا کہ یہ دونوں اخبار بھی منظور شدہ فہرست میں نہیں ہیں ــــــ میں نے پوچھا۔

"منظور شدہ فہرست میں آخر کون سے اخبارات ہیں پھر؟"

سنیئر جیلر نے جواب دیا۔

ڈان انگریزی!

ڈان اردو!!

....

....

....

میری طویل ہوتی ہوئی گفتگو سے "صاحب بہادر" کچھ چونکا۔ اور مجھے

غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہیو یو اینی تھنگ مور ٹو سے؟"

میں نے جواب دیا ــــــ "ہاں ایک اور بات۔ مجھے کچھ لکھنے پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ میں ایک رائٹر ہوں۔"

صاحب بہادر پھر چونکا اور پوچھا۔

"آر یو اے پروگریسو رائٹر ــ؟"

(کیا تم ترقی پسند ادیب ہو)

میں نے جواب دیا۔

"یس ــــ از دیئر اینی آبجکشن؟"

لیکن صاحب بہادر "اوہ آئی سی، آئی سی" کہتا ہوا بڑھا۔ میں نے اسے پھر متوجہ کیا کہ مجھے لکھنے پڑھنے کی اجازت دی جائے تو اس نے کہا۔ "نو۔ نو۔ وی کانٹ گیو یو پرمیشن۔"

سپرنٹنڈنٹ بہادر چہرے پر نفرت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ گویا "پروگریسو رائٹر" بہت ہی خطرناک اور ذلیل قسم کا مجرم ہوتا ہے۔

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن ایک سپاہی نے نہایت بدتمیزی سے میرے کندھے پکڑ کر مجھے بٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا اور اس سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔

"کیا آپ یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ایک معمولی سپاہی آپ کے سامنے ایک سیاسی قیدی کے ساتھ کس طرح سلوک کر رہا ہے؟"

سپرنٹنڈنٹ نے صرف ہاتھ کے اشارے سے سپاہی کو منع کیا اور پھر رعونت، تکبر اور نخوت کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

میں نے سوچا ایسی باتوں سے اثر لینا ہی بیکار ہے کیونکہ یہ صرف چند آدمیوں کے تکبر اور نخوت کا دور ہی تو ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ پروگریسو رائٹر یا ترقی پسند ادیب نے باہر کی دنیا ہو یا جیل۔ اپنے قلم کی قوت اور نئی فکر کی طاقت سے دنیا کے ہر ناجائز مالک کو چونکا دیا ہے اور وہ اسے گھبرا کر دیکھنے لگتا ہے۔

مجھے سپرنٹنڈنٹ کی خوف و نفرت سے ملی جلی نظروں نے ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ ان نظروں نے میرے رگ و پے میں نیا خون دوڑا دیا تھا اور میں یقین اور پختہ ہونے لگا تھا کہ آنے والی انسانوں کی دنیا کو نہ ٹرومین کے ایٹم بم سے جیتا جائے گا اور نہ شاہ جارج ششم کی فوجوں سے اس پر فتح حاصل کی جائے گی۔ آنے والی خالص انسانی دنیا صرف ترقی پسند ادیب کے قلم سے بنائی جائے گی ____ یہ میکسم گورکی، مایکا نسکی، رومین رولان، جیولیس فیوچک رالف ناکس، کاڈویل، اور لوہسون ہی کے قلم تھے۔ جنہوں نے آج بھی آدھی سے زیادہ دنیا کو انسانوں کے انسان نما دشمنوں کے ناپاک قبضے سے چھڑا کر

آزاد کرایا تھا اور آدھی سے زیادہ زمین انسانوں اور صرف انسانوں کے حوالے کی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ کا راؤنڈ ختم ہو چکا تھا۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ قیدیوں کو سخت بھوک لگی تھی۔ ہر قیدی سپرنٹنڈنٹ کو گالیاں دے رہا تھا۔ لیکن بے چاروں کو کیا معلوم کہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہو یا کسی ملک کا بادشاہ، ان کی بڑائی اور ان کی عظمت اسی بات پر قائم ہے کہ انسانوں کو بھوکا مارو۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ لوگوں کو جتنا بھوکا مارو گے۔ اتنے ہی بڑے آدمی بنو گے۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ دو گھنٹے بھوکا مارتا ہے تو کسی جمہوریہ کا وزیر اعظم یا کسی سلطنت کا بادشاہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھوکا مارتا ہے۔

بھتہ آتے ہی سارے قیدی اس پر ٹوٹ پڑے جس طرح کسی مردہ جانور کی لاش پر چیل، گدھ اور کوّے ....

(۷)

مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن جونہی میں نے اپنے کھانے پر نظر ڈالی تو
پھر بھوک نے دم توڑ دیا۔ سالن اُتر گیا تھا۔ چپاتیاں چمڑے کی طرح سخت ہو گئی تھیں
اور موٹے موٹے چاولوں میں ہلکی سی بساند پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے سامنے دیکھا کہ سی
کلاس کے تین قیدی بڑی للچائی ہوئی نگاہوں سے میرے کھانے کو دیکھ دیکھ کر اپنی
رال ٹپکا رہے ہیں۔ میں نے سوچا اگر کھانے سے پیٹ میں درد نہ بھی ہو تو کم از
کم یہ لالچی نظریں میرے پیٹ میں نظر بن کر ضرور اتر جائیں گی۔ اس لئے میں
نے سامنے کھڑے ہوئے تین قیدیوں میں سے ایک کانے قیدی کا انتخاب کیا کیونکہ
وہ صرف ایک آنکھ سے میرے کھانے کی طرف دیکھ رہا تھا میں نے اسے اپنا کھانا دے
دیا لیکن اس پر تینوں میں چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ ایک نے سالن [illegible]

دوسرے نے روٹیاں لے لیں۔ اور کانے قیدی کے حصے میں چاول آئے۔
مجھے یہ معلوم تھا کہ انہوں نے اپنے حصہ کا کھانا ابھی ابھی کھایا ہے لیکن
اس کے باوجود وہ میرا کھانا ایسی تیزی سے چپڑ چپڑ کھا رہے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جب سے
وہ جیل میں آئے ہیں انہیں کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوا ——— صرف جیل ہی
کا ذکر کیا ہے۔ جیل کے باہر بھی تو انہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں نصیب ہوتا اور یہ
پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنا ہی دراصل انہیں جیل میں کھینچ کر لے آتا ہے۔ انہیں پیٹ
بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ جبھی تو وہ چوری کرتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ دھوکے دیتے
ہیں۔ اور پھر گرفتار ہو کر جیل آ جاتے ہیں کہ یہاں انہیں اطمینان سے روٹی ملا کرے
گی مگر معلوم ہوتا ہے کہ غریب آدمی کو کہیں بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملے گی۔
اس لئے اگر ایک طرف لوہے کی سلاخوں اور پتھروں کی دیواروں والی جیل ہے تو
دوسری طرف یہ وسیع و عریض دنیا تفکرات اور مصیبتوں کی جیل ہے۔
جیل چاہے وہ دولت مندوں کی یہ دنیا ہو یا یہ سنگ و آہن کی جیل
وہ انسان کے بھوکے پیٹ سے پیدا ہوتی ہے بھوکا پیٹ جیل کی عمارت کا نقشہ
ہوتا ہے جب تک انسان کا پیٹ بھوک کی وجہ سے اندر ہی اندر دھنستا رہے گا۔
اس وقت تک زمین کے جسم پر جیل کے پھوڑے اُبھرتے رہیں گے اور دنیا کی فضا
جرائم اور بداخلاقیوں سے متعفن اور مسموم ہوتی رہے گی۔
[illegible] دنیا میں جیل کی عمارت بنانے کا تخیل کب پیدا ہوا اور جیل کی پہلی عمارت

کس ملک میں بنائی گئی ۔ یہ میں نہیں جانتا ۔ لیکن اگر میں اُس دور میں پیدا ہوتا
تو اس استبدادی طاقت کو جس کے دل میں جیل کا تخیل پیدا ہوا اور جس نے جیل
کی عمارت بنائی ——— یہ مشورہ ضرور دیتا کہ تم اگر جیل کو انسانی اخلاق سُدھارنے
کا ذریعہ سمجھ رہے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے ۔ جیل کی تعمیر سے پہلے یہ معلوم کر لو کہ تم
جیل کی تعمیر کیوں کر رہے ہو؟ لیکن ——— لیکن میں فوراً اپنے آپ پر آ گیا اور
یہ محسوس کر کے مجھ پر عجیب سا کھسیانہ پن طاری ہوا کہ میں جب سے جیل میں
آیا ہوں ۔ بڑا جذباتی ہو گیا ہوں ۔ جانے کیسی کیسی باتیں سوچتا ہوں اور اپنے آپ
سے کتنی کتنی دور بہک کر نکل جاتا ہوں ۔ اس حقیقت کو میں تسلیم بھی کرتا ہوں کہ
جیل بھوکے پیٹ کا ایک آہنی اور سنگین خاکہ ہے ۔ لیکن جیلوں کی تعمیر کرنے
والا کبھی کسی سچائی اور حقیقت کو تسلیم کر سکا ہے ——— ! جیلوں کو تعمیر
کرنے والی استبدادی قوت تو صرف یہ چاہتی ہے کہ صرف وہ آزاد رہے
اور باقی ساری دنیا اس کی غلامی میں اور اس کی جیلوں میں گرفتار رہے ۔ تا کہ
اس کا تخت ، اس کا تاج ، اس کا محل اور اس کا خزانہ محفوظ رہے ۔
استبدادی طاقت صرف بھوکے پیٹوں اور جیلوں کے سہارے زندہ
ہے اور اسی لئے وہ دنیا کے ان گنت انسانوں کے منہ سے نوالے چھین چھین
کر انہیں زندگی کی جیل اور سنگ و آہن کی جیل میں گرفتار کرتی چلی جا رہی ہے
مجھے اپنی پڑوسن بیوہ کا لڑکا کریم یاد آ گیا جو بے حد آوارہ ہو گیا تھا

اور محلے کی ہر واردات میں اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ضرور دخل ہوتا ۔ اسے
میں یا محلے کا کوئی اور شریف آدمی سمجھاتا کہ یہ حرکات چھوڑ دے تو وہ کہتا ۔

بابو جی ، آپ لوگوں کو تو بس نصیحت کرنی آتی ہے اپنے پیچھے میری
بیوہ ماں ہے ۔ تین نوجوان بہنیں ہیں ۔ چار چھوٹے بھائی ہیں اور
مجھے نوکری نہیں ملتی تو پھر آخر آپ کی جیب نہ کاٹوں تو کیا کروں !

ہم سب شریف آدمی اسے ڈراتے ۔

" اور اگر تو جیل چلا جائے تو ——— ؟ "

کریم بڑے اطمینان سے جواب دیتا ۔

" تو پھر کیا ہوگا ۔ ماں ساری روتے روتے مر جائے گی ۔ بہنیں اپنے اپنے
یار ڈھونڈھ کر کہیں فرار ہو جائیں گی ۔ چھوٹے بھائی یکے بعد دیگرے سب جیل
ہی میں آ جائیں گے ۔ اور میں ——— مجھے تو تین وقت کی روٹی مفت
ملے گی ۔ "

کاش ، کریم میرے چھوٹنے تک اندر نہ آئے اور میں اسے جا کر بتاؤں
کہ وہ تین وقت کی جس مفت روٹی کی آس لگائے بیٹھا ہے وہ کیسی ہے ۔ کس
طرح ملتی ہے اس میں انسان کے لئے غذائیت کتنی ہے ۔ صحت کتنی ہے ۔ بیماری
کتنی ہے اور بھوک کتنی ہے ؟

بلاشبہ جیل میں تین وقت کی روٹی ہر قیدی کو دی جاتی ہے لیکن شاید

باہر وہ جتنی روٹی کھاتا ہے۔ جیل کی تین وقت کی روٹی شاید اس کی نصف بھی
ہوتی ہوگی۔ باہر وہ صرف گندم روٹی کھاتا ہوگا جیل کی گندم میں جوار، بھ
کے علاوہ کنکر اور پتھروں کے ریزے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی قیدی دانتوں
میں کرکراتے پتھر سے ہچک کر بھتہ تقسیم کرنے والے سپاہی سے شکایت کرتا
تو سپاہی ناک کے نتھنے پھلا کر ایک فحش گالی دیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

"اؤ بھین یا ——— تو نے اگر گندم کی روٹی کھانی تھی تو یہاں کیوں آیا
لاٹ صاحب کے بچے۔ تو تو پلاؤ مانگے گا تاکہ اور طاقت آئے اور باہر نکل کر
کرتوتوں میں اور اضافہ ہو ......"

گویا جیل میں انسانی طاقت گھٹانے اور اس کے جسم کو کمزور کرنے
لئے غذا دی جاتی ہے تاکہ اس کی طاقت میں اضافہ نہ ہو اور وہ استبدادی طاقت
سے نہ ٹکرا جائے جس نے اس کے منہ کے نوالے چھینے، جس نے اس کو بداخلاقی
اس راستے پر دھکیل دیا جو جیل کے پھاٹک تک پہنچا دیتا ہے۔

علوی کی آواز پر میں چونک پڑا۔ علوی پوچھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹھے بیٹھے ———؟"

میں نے جواب دیا۔

"جیل میں جہاں انسان کو کوئی کام نہ ہو وہ سوچنے اور سوچتے رہنے
کے علاوہ اور کیا کام کر سکتا ہے۔ جسم مفلوج ہوا جا رہا ہے۔ کم از کم ذہن
تو مفلوج نہ ہونے پائے ——— !"

علوی نے کہا۔

"ارے ذرا ادھر آؤ۔ تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں۔"

میں علوی کے ساتھ گیا۔ جہاں ہم سیفٹی قیدیوں کا بھتہ تقسیم کرنے والا
سپاہی دیگوں کے سامنے کھڑا اور یٰسین اس سے اُلجھ رہا تھا میں نے علوی سے
پوچھا۔

"کیوں بھئی ——— کیا سپاہی نے کہیں ٹیٹ تو نہیں ماری تھی کہ
یٰسین اس سے اُلجھ پڑا ہے؟"

علوی کے بجائے یٰسین خود اپنی بغداد کے چور جیسی جنگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے
ہوئے بولا۔

"سنو جی جلیس صاحب، ہم سیفٹی والوں کو روزانہ پانچ اونس دیتے
نہیں کہ اس نے کتنے اونس کہا تھا۔ فرض کر لیجئے کہ پانچ اونس) گوشت ملنا چاہیے
لیکن یہ سپاہی لوگ ساری بوٹیاں خود ہضم کر لیتے ہیں اور ہمیں صرف سالن ہی
سالن ملتا ہے۔"

سپاہی نے کہا۔

"اچھا زیادہ بک بک نہ کر۔ ابھی ترازو منگوائی ہے آئندہ
سے روز تول تول کر دیا کروں گا۔ اگر یہ پانچ اونس سے کم ہوئیں

"تو پھر سالے تیری ...."

پھر سپاہی نے میری اور علوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ بابو لوگ بھی تو سیفٹی ہیں۔ لیکن کیا مجال بے چاروں نے کبھی ایک بار
بھی کھانے کی شکایت کی ہو۔ شریف اور رذیل میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔"

سپاہی کے اس جملے نے مجھے پھر چونکا دیا۔ سپاہی نے شریف اور رذیل
کے درمیان خوب فرق محسوس کیا ہے۔ واہ وا۔ شرافت اور رذالت کی بالکل
ہی نئی تفسیر ہے کہ جو شخص غاصب سے اپنا غصب کیا ہوا حق مانگتا ہے جو بھی
ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے وہ رذیل ہے۔ اور جو شخص ظلم و استبداد
غصب و ناانصافی کے خلاف کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا وہ شریف
ہے اور پھر بڑے مزے کی بات ہے کہ ایک وردی پوش سپاہی اور وہ بھی
جیل کا سپاہی شرافت اور رذالت میں تقابل کر رہا ہے اس کی زبان سے
شرافت اور رذالت کے بارے میں یہ باتیں سن کر مجھے اتنا ہی عجیب محسوس
ہو رہا تھا جیسے صدر ٹرومین کی زبان سے امن و انسانیت، مساوات اور
جمہوریت کے دعوے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات سچ مچ اتنی ہی اچنبھے
کی تھی۔ جتنی کہ ابوالکلام آزاد کا کسی عام جلسے میں سیاسی تقریر کرنے کی بجائے
ٹھمری کا راگ الاپنا ——— !

اسی اثنا میں دیگیں ڈھونے والا قیدی کچن سے ترازو اٹھا لایا

سپاہی نے یٰسین کے ہاتھوں سے سالن کی چمچی چھین لی۔ اس میں سے بوٹیاں نکال
کر ترازو کے پلڑے میں رکھ دیں۔ بوٹیاں سچ مچ زیادہ تھیں یا پھر سپاہی ڈنڈی
مار رہا تھا کہ بوٹیاں مقررہ اونس سے زیادہ وزنی نکلیں ——— میرا خیال تھا یہ
کہ بوٹیاں سچ مچ وزن میں کم ہوں گی۔ اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس
ہڈی پر گوشت بھی ہے یا نہیں ہے!

سپاہی نے ترازو میں سے ایک بوٹی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی اور بڑے
فاتحانہ انداز میں یٰسین سے بولا۔

"لے سالے ضد کرتا تھا نا۔ اب تو اور بھی کم ہو گئی ہڈی۔
اب تو تجھے روز تول کر دیا کروں گا۔"

یٰسین کی جگہ کوئی فی الواقع خوددار آدمی ہوتا تو وہ شاید خاموش ہو جاتا
لیکن یٰسین نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔

"سائیں۔ معاف کرو، مجھ سے غلطی ہوئی آئندہ کبھی نہیں کروں گا چاہے
آپ ایک بوٹی بھی کیوں نہ دیں چپ چاپ لے لوں گا۔ بس اس مرتبہ معاف
کر دو!"

دوسرے سارے قیدیوں نے بھی یٰسین کی طرف سے نہایت خوشامدانہ
انداز سے سفارش کی تو سپاہی نخوت سے اکڑ گیا اور بولا۔

"نہیں، میں تجھے ہرگز نہیں دوں گا۔ اسے پھینک دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے بوٹی اٹھا کر دور پھینک دی اور دیگیں قیدیوں کے سرو
پر اٹھوا کر چلا گیا۔

میں پھر برآمدے کی کمان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں موند کر تھوڑ
دیر لیٹنا چاہتا تھا کہ اچانک یٰسین کی آواز سنائی دی۔

"خبردار ——— یہ میری ہے!

میں نے گھوم کر دیکھا کہ یٰسین آخر کس گرانقدر ملکیت کا ایسا بلند بانگ
دعویٰ کر رہا ہے۔

میں نے دیکھا کہ سپاہی نے اس کے سالن کی جو بوٹی اٹھا کر دور پھینکی
تھی۔ ایک قیدی دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اب خبردار کی آواز سے
رک گیا تھا ادھر یٰسین نوالہ چباتے چباتے ہی اٹھا اور بوٹی کی طرف بڑھا۔
بوٹی کے پاس پہنچ کر یٰسین اور دوسرے قیدی میں تکرار ہو گئی وہ قیدی کہہ
رہا تھا۔ "یہ بوٹی تو سپاہی نے اٹھا کر پھینک دی تھی"۔

یٰسین کہہ رہا تھا۔

"ہاں سالے ہاں پھینکی تھی تو کیا ہوا میرے ہی سالن سے نکال کر پھینکی تھی"۔

قیدی کہہ رہا تھا۔

"ارے جا پرے ہٹ۔ بڑا آیا دھونس جمانے والا۔ تیرے باپ کے
سالن سے نکال کر پھینکی تھی۔" تیرا نام لکھا ہے سالے اس بوٹی پر"۔

ایک بوٹی کی خاطر دو کتوں کو لڑتے تو میں نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن ایک
بوٹی کے لئے دو انسانوں کو لڑتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا یہ منظر میرے لئے
بالکل ہی نیا اور نہایت ہی دلچسپ تھا۔ میں جس وقت تک وہاں پہنچا۔ یٰسین
اور قیدی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے تھے۔

میں، علوی اور ببری نے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ تو اس
وقت سارے قیدی یٰسین کے طرف دار ہو چکے تھے اور محمد مکرانی کہہ رہا تھا۔

"جس کا مال اس کو ملنا چاہئے۔ یہ بوٹی یٰسین کی ہے اور یٰسین کو ہی ملے گی"۔

یہ کہہ کر اس نے بوٹی اٹھائی اور ہاتھ سے جھاڑ پونچھ کر یٰسین کے حوالے کر
دی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور سارے انسان نما کتے خاموش ہو گئے تھے لیکن رہ
رہ کر میرے دل میں محمد مکرانی کا یہ جملہ گونج رہا تھا "جس کا مال اسکو ملنا چاہیئے"۔
یعنی کیا جب محمد مکرانی کسی کی جیب کاٹتا ہے یا کسی کا مال چوری کرتا ہے یا پھر
کسی کے گھر ڈاکہ ڈالتا ہے تو کیا یہی جملہ جیب تراشی، چوری اور ڈکیتی کے وقت
اس کی رہنمائی کرتا ہے ——— ؟ اور کیا یہی مقولہ اس کی زندگی کا نصب العین
ہے ؟

(۸)

ہم کھولیوں میں بند ہو چکے تھے اور سنیچر کی چمکیلی شام دبے پاؤں اس عظیم الشان رات کے چمکیلے ایوان میں داخل ہو رہی تھی جو ہفتے کی ساری ساتوں راتوں میں مجھے سب سے زیادہ پیاری رات ہے۔ سنیچر کی رات —— گرینڈ گالا نائیٹ —— نہ جانے کتنے برسوں سے میری محبوب ترین رات بنی ہوئی ہے۔ میں اس رات سے بے حد پیار کرتا ہوں۔ یہ رات میرے لئے خوشی اور شادمانی کے لمحوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر ہے۔ یہ رات ہوٹل میٹروپول کا چمکیلا ڈانس فلور ہے۔ یہ رات کیبرے ناچنے والی سرخ و سپید لڑکی بلورین آنکھوں کے کاجل کی ایک لمبی سی لکیر ہے۔ یہ رات اسکاچ وہسکی کی بوتل ہے یہ رات میرا جی کی نظم، سعادت حسن منٹو کا افسانہ اور عصمت چغتائی کا ناول

ہے یہ رات عورت کی چمکیلی زلف ہے۔ یہ رات عورت کا نرم گرم جسم ہے۔

مگر یہ رات "اب" وہ رات "بن گئی تھی۔

پبلک سیفٹی ایکٹ کے خونخوار دیو نے میری زندگی کے شب و روز کے ڈھیر سے میری یہ سندر اور پیاری رات نکال کر الگ کر لی تھی اور میرے سامنے ایک کھولی بھر بھیانک اندھیرا پھینک دیا تھا۔ یہ اندھیرا شب دیجور کی ہولناکی شب فراق کی بے قراری۔ اور شب زندان کی اذیت ناکی کو ایک ساتھ ملا کر اور گوندھ کر بنایا گیا تھا۔

پھر بھی میری نظریں اندھیرے کی اس قناعت کو چھید چھید کر دور بہت دور دیکھ رہی تھیں کہ ہوٹل میٹروپول کی روشنیاں نوجوان اور خوبصورت شرمیلی لڑکیوں کی طرح تیز تیز پلکیں جھپکا رہی ہیں، مسلسل سات دن تک تھکے ہارے جسم، چمکیلے شفاف ڈانس فلور پر ناچ ناچ کر اپنی تھکن اتار رہے ہیں اور فضاؤں پر اسکاچ وہسکی کے نشے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ عورتیں اور مرد جسم سے جسم ملائے ناچ ناچ کر گا رہے ہیں کہ —— "میرے محبوب آج کی رات مجھے محبت کے سوا کچھ بھی نہ دے —— !"

اندھیرے کے پردے سے منہ نکال کر میں اپنے گھر کی خواب گاہ میں ہوں کہ فاطمہ نے اپنے جوڑے کھول کر زلفوں کو کمر تک لہرا دیا ہے اس نے سفید، ریشمیں ملائم ساڑھی باندھ لی ہے اور سیاہ مخملیں بلاؤز میں

ایو تنگ اِن پیرس کے عطر کی خوشبوؤں کو سموکر اُجلے نرم بستر پر گلاب کی جھکتی پتیاں بکھیر رہی ہے۔

لیکن، لیکن ____ لیکن وہ رات ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس بن گئی ہے۔ میں اندھیرے کی فصیلوں کو گرا کر تو آزاد ہو سکتا ہوں۔ میرا خیال، میرا تخیل، آہنی دروازوں کو توڑ کر اور اونچی سنگین دیواروں کو پھلانگ کر جہاں جی چاہے جا سکتا ہے۔ اسے نہ کوئی پبلک سیفٹی ایکٹ کا دیو پکڑ سکتا ہے اور نہ کوئی جیلر گرفتار کر سکتی ہے۔ مگر میں ایک جسم بھی ہوں، وہ جسم جو سنیچر کی رات کی ساری رعنائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے بے قرار ہے وہ جسم جو ایک نازک اور ملائم جسم کا لمس اور اسکاچ وہسکی کے نشے کے لئے ترس رہا ہے۔ اب وہی جسم گرم گرم سانسوں کی حدت سے پھنک رہا ہے اور بھٹکتا جا رہا ہے۔ ایک فنکار کا جسم نہیں، بلکہ ایک قیدی کا جسم ہے!

جیسے جیسے رات بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے کانوں میں باہر کی شادماں اور مسرور دنیا کا شور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ آزاد مرد اور آزاد عورتیں گانے گاتے اور ناچتے ناچتے میرے قریب آ گئی تھیں۔ اور مجھے گھیرے میں لے کر گانے کے بجائے چیخ رہی تھیں کہ ____ کہ "میرے محبوب آج کی رات مجھے محبت کے سوا کچھ بھی نہ دے"۔

اور پھر اچانک میں نے ایسا محسوس کیا کہ ہوٹل میٹروپول کی ساری

روشنیاں بجھ چکی ہیں۔ ساری کرسیاں ویران ہو چکی ہیں۔ میزوں پر وہسکی کی خالی بوتلوں، خالی گلاسوں اور سگریٹ کے خالی ڈبوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور میں ہوٹل کے ایک اٹھائی گیر بیرے کی طرح فرش پر بٹوؤں اور جیبوں سے گری ہوئی اکنیوں، چونیوں، اٹھنیوں، رومالوں، زلفوں کی کلپوں، کوٹ کے کالروں اور جوڑے کے گرے ہوئے پھولوں کو چنتا پھر رہا ہوں۔

میں ان ساری تلخ تلخ یادوں کی تیز و تند شراب پیتا رہا۔ میرے آغوش میں نہ کوئی فاطمہ تھی اور نہ میری آنکھوں کے سامنے کوئی انگرڈ برگمن اور کاسمی کوٹل۔ نہ کوئی میٹروپول تھا اور نہ کوئی رین بو آئی لینڈ! صرف میں تھا اور اندھیرا تھا۔

صرف میں اکیلا تھا اور بھیانک جیل تھی!

اور سنیچر کی رات، عشق میں چور اس عورت کی طرح، جو چوری چھپے اپنے محبوب سے ملنے آئی ہو۔ طلوع آفتاب کے اندیشے سے گھبرا کر زمین کو آخری بار چمٹا چمٹا کر پیار کرنے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مغرب کی طرف لپکی چلی جا رہی تھی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، کہیں کوئی پکڑ نہ لے۔

کھولیوں کے تالے کھلنے لگے۔ میں نے علوی کو جگانا چاہا۔ لیکن علوی نے نیم بیداری کے عالم میں جواب دیا۔

"آج اتوار ہے، آج تو چھٹی ہے۔ آج کا دن سوتے سوتے ہی گزر جائے

تو اچھا ہے۔ آج کا دن تو امیدوں سے خالی ہوتا ہے۔"

میں کھولی سے باہر نکل آیا۔ چھٹی کا اظہار کرنے بلکہ چھٹی کو قیدیوں پر طاری کرنے کی خاطر جیل کے آفس پر لہرانے والا پاکستانی پرچم بھی اُتار دیا گیا تھا تاکہ پتہ چلے کہ آج چھٹی ہے۔

جیل ہفتے کے چھ دن اپنے اندر سینکڑوں قیدیوں کو بند رکھتی ہے اور ساتویں دن خود بھی بند ہو جاتی ہے۔

قیدیوں کے لئے اپنا چھ دن تک بند ہوتے رہنا اتنا باعثِ اداسی نہیں جتنا کہ خود جیل کا بند ہو جانا۔ میں نے دیکھا کہ روزانہ دس بجے کے بعد سے جیل کا دفتر کھل جاتا ہے تو ہر قیدی کے دل میں اپنی رہائی کی کوئی نہ کوئی امید پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس امید کے ساتھ ساتھ رکھتا ہے جو اسے تسلی دیتی رہتی ہے کہ گھبراؤ نہیں ——— ابھی ابھی کوئی تمہاری ضمانت دے کر جائے گا یا تمہارا پروانۂ رہائی آجائے گا۔ میں نے ایسے ایسے قیدیوں کو بھی دیکھا ہے۔ جن کو لمبی لمبی بلکہ عمر قید کی سزا دی جا چکی ہے۔ وہ بھی بڑی پُرامید نظروں سے جیل کے دفتر کی اونچی عمارت کی طرف دیکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہیں سے کوئی حکم نامہ اس دفتر میں آجائے اور انہیں رہا کر دیا جائے۔

امید ——— ؟! امید کتنی ہی جھوٹی کیوں نہ ہو انسان پورے خلوصِ دل سے اس کے جھوٹ پر سچ کی طرح بھروسہ کرتا ہے۔ لیکن ایک بات۔ امید کا جھوٹ بھی

اتنا حیات آفریں، اور زندگی بخش ہوتا ہے، کہ میں نے بے روزگاری سے تنگ آئے ہوئے فاقہ کشی سے نڈھال اور موت کے بستر پر لیٹے ہوئے سینکڑوں مریضوں کو دیکھا ہے۔ جو محض امید کی جھوٹی جھوٹی تسلیوں کے سہارے بھی لمبے لمبے عرصے تک اس دنیا میں زندہ رہے ہیں اور زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

جیل میں تو قیدیوں کا امید کے سوائے کوئی اور دوست یا ہمراز نہیں ہوتا لیکن اتوار کے دن بے چارہ قیدی اپنے اس چوبیس گھنٹے کے دوست سے بھی جُدا ہو جاتا ہے اور اپنے اردگرد اپنی طرح کے سینکڑوں قیدیوں کے باوجود بھیانک تنہائیوں کے ہجوم میں گھر جاتا ہے۔

سامنے دیوار کی منڈیر پر ایک کوا آ بیٹھا میں اس آزاد پرندے کی آزاد پروازی کو رشک و حسد کی نگاہوں سے بغور دیکھ رہا تھا کہ پیچھے سے محمد مکرانی آیا اور بولا۔

"وری کوا دیکھ رہے ہو جلیس صاحب ——— آج یہ کائیں کائیں نہیں پکارے گا۔ چھٹی کے دن وری کوا سالا جیل کی دیوار پر گپ چپ بیٹھا رہتا ہے۔"

محمد مکرانی کی بات سے مجھے اپنا بچپن اور اپنی نانی کی توہم پرستی یاد آگئی۔ بچپن میں میں اکثر دیکھا کرتا تھا کہ جب بھی ہمارے گھر کی منڈیر پر کوئی کوا آ بیٹھتا اور "کائیں کائیں" پکارنے لگتا تو میری نانی میری امّی کو پکارنے لگتیں۔

"بیٹی نور النساء ——— باورچن سے کہو آج سویاں بھی ضرور پکائے

"آج ضرور مہمان آنے والے ہیں کوا پیغام لایا ہے بیٹی!"

اُن دنوں نانی کے ہم دس نواسے اور ایک نواسی، نانی کا مذاق اُڑایا کرتے تھے کہ نانی اماں کو جب سویاں کھانے کی خواہش ہوتی ہے تو وہ کوا پکانے کا بہانہ ضرور ڈھونڈ لیتی ہیں۔

لیکن اب محمد مکرانی کی آواز سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی ایک عالم گیر مرض ہے۔ اس میں بنگلور شہر کی ایک بوڑھی نانی ہی مبتلا نہیں ہے۔ بلکہ جہاں جہاں بھی جہالت ہے وہاں محمد مکرانی جیسے لاتعداد نوجوان بھی اس میں مبتلا ہیں۔ میں اس وقت محمد مکرانی کو یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ یہ صرف ایک توہم ہے۔ محض ضعیف الاعتقادی ـــــ کوا ایک پرندہ ہے وہ ہمارے عزیزوں اور مہمانوں کو کس طرح پہچان سکتا ہے کس طرح ان کا پیغام بر بن سکتا ہے لیکن محمد مکرانی نے ایک ایسی بات اس وقت کہی کہ معاً خوشی کے مارے میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ محمد مکرانی نے کہا تھا۔

"جلیس صاحب، ورا جلدی نہا دھو کر آؤ۔ ہم لوگ اِدھر آج چائے پکا رہا ہے۔ چائے!"

چائے ـــــ! مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کسی صحرا میں پیاس سے دم توڑتے ہوئے مسافر کو دور پانی کا چشمہ نظر آ گیا ہو میں دن میں دس دس، بارہ بارہ پیالیاں چائے پینے والا شخص ادھر کتنے دنوں سے چائے کے ایک گھونٹ کے لئے ترس

رہا تھا۔ میں محمد مکرانی سے یہ پوچھنا بھی بھول گیا کہ تمہارے پاس چائے کی پتی کہاں سے آ گئی۔ چینی کون دے گیا۔ دودھ کہاں سے لائے ہو۔ میں کچھ بھی نہ پوچھ سکا فارہنس ٹوتھ پیسٹ کا آدھا ٹیوب لکس صابن کا ٹکڑا اور اس کا میلا کچیلا تولیہ اٹھا کر حوض پر نہانے چلا گیا۔ علوی نے شاید چائے کے مژدہ جانفزا سے دن بھر سوتے رہنے کا ارادہ توڑ کر وہاں آ گیا۔ ہم جلدی جلدی نہا دھو کر واپس کھولی پہونچے تو سگریٹ کے ایک خالی ٹن میں چائے بھر کر محمد مکرانی نے میرے ہاتھ میں تھما دی ـــــ چائے کے ٹن کو ہاتھ میں لیتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں پرانی کہانیوں کے ویران جزیرے میں نووارد اجنبی رابنسن کروسو ہوں جسے بھوک اور پیاس سے نڈھال ہوتے وقت اچانک ایک ناریل ہاتھ لگا ہو۔

چائے کسیلی ہونے کے باوجود لذیذ تھی اور اس کا مزا شہر کے ایرانی ہوٹلوں کی ڈیڑھ آنہ پیالی والی چائے سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔

چائے پینے کے بعد میں نے محمد مکرانی سے پوچھا۔ یہ چائے کی پتی اور چینی تمہیں کہاں سے مل گئیں۔

محمد مکرانی نے جواب دیا۔

"جلیس صاحب، آپ سیاسی قیدی ہیں مگر جیل پر اپن کی حکومت ہے کل ہم کچن میں جا کر سپاہی سے مانگ لایا ہے۔ اگر وہ نہیں دیتا تو وڑی ہم سالے کا کھوپڑی نکال دیتا۔"

پھر اس نے کہا۔

"آپ صرف چائے کا بولتا ہے۔ ابھی تو ہم ادھر روزانہ چرس منگا تا ہے خود آپ نے خود ہم کو چرس پیتے دیکھا ہے۔ اجی آپ کہیں گا تو ہم ادھر عورت بھی منگا سکتا ہے۔"

میں نے یونہی تعجب کا اظہار کیا ـــــــ اچھا ــــــ!"

محمد نے کہا۔

اور کیا۔ ارے بابو پیسہ سب کچھ کراتا ہے۔ یہ سپاہی لوگ تو پیسے کے لالچی ہوتے ہیں۔ ہم ادھر سے باہر اپنے بھائی کو سپاہی کے ذریعے چٹھی بھیجتا ہے۔ وہ سپاہی کو ایک روپیہ انعام دیتا ہے اور اس کے ذریعے وہی ہم کو چرس بھیجتا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

"خیر تم کسی طرح بھی کیوں نہ منگاتے ہو۔ مجھے اس سے بحث نہیں لیکن چائے کے لئے تمہارا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

محمد بولا ــــــــ چائے کی کیا بساط ہے۔ جلیس صاحب۔ وہی تم ہم کو چپکا چپی شرمندہ کرتا ہے۔"

اتفاق کی بات تھی کہ ادھر میں نے چائے کا آخری گھونٹ پیا تھا کہ ادھر سے سگریٹ منشی (جو آج کل جیل سے رہا ہو کر ایمپریس مارکیٹ کے پاس

فاؤنٹین پین کی پتیاں درست کرنے کا کام کرتا ہے) سگرٹوں کا تھیلہ گلے میں لٹکائے آیا اور میرے پانچ کیپسٹن اور علوی کے تین برکلے سگریٹ دے دیئے۔ بس پھر کیا تھا لطف آ گیا۔ بڑے عرصے کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا جیسے واقعی ناشتہ کیا ہے۔ ایک اچھا اور لذیز ناشتہ بھی صبح کو کتنا خوشگوار بنا دیتا ہے۔

علوی نے کہا۔

"آج دن بہت آہستہ آہستہ گذرے گا۔ بالکل اس پڑھنے سے جی چرانے والے کاہل طالب علم کی طرح جو بڑی بے دلی سے آہستہ آہستہ اسکول کی طرف جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر کیا کیا جائے ہم اس کے قدموں کو نہ تیز رفتاری عطا کر سکتے ہیں اور نہ اس کے پر لگا سکتے ہیں۔ علوی تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم قیدی ہیں اور قیدی سے زیادہ بے بس اور اپاہج انسان کوئی نہیں ہوتا۔"

علوی نے کہا۔

"یار بڑے عرصے سے سنتا آیا ہوں کہ جیل میں ایک لائبریری بھی ہے آؤ وہیں سے کچھ کتابیں لے آئیں۔"

میں نے جواب دیا۔

"فوراً چلو۔ بلکہ ابھی ابھی چلو۔ یہ بھی مقام فکر ہے کہ جیل میں ایک لائبریری

تو ہے۔ لائبریری دنیا کی حسین ترین عمارت ہوتی ہے۔ میں ایک چھوٹی سی لائبریری کو تاج محل جیسی عمارت پر بھی ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں ——!"

علوی نے جیلر جمعدار مہر شاہ سے لائبریری جانے کی اجازت لی اور مہر شاہ نے پی پی کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ کیونکہ پی پی لائبریری کا انچارج تھا۔

عجیب لائبریری تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برلن کے یہودیوں کی لائبریری ہے یا پھر شمالی کوریا کے کسی شہر کی لائبریری جسے نازی اور امریکیوں نے تباہ کر دیا ہے۔ ساری کتابیں بڑی بوسیدہ حالت میں تھیں۔ اکثر کتابوں کو دیمک چاٹ گئی تھی اور لائبریری میں پرانے اور بوسیدہ کاغذ کی عجیب سی بو رچی ہوئی تھی۔ لائبریری کے بجائے وہ قلمی نسخوں اور نوادرات کا کوئی عجائب گھر معلوم ہو رہی تھی۔ بیشتر کتابیں سندھی اور گجراتی میں تھیں۔ انگریزی ناول نہایت ادنیٰ درجے کے تھے اور سستا امریکی لٹریچر شلف میں ٹھنسا ہوا تھا——

بڑی دیر کی تلاش کے بعد میں نے مایوس ہو کر علوی سے کہا۔

"ایسی کتابوں کو پڑھنے سے نہ پڑھنا بہتر ہے آؤ اپنے اپنے سناٹوں میں لوٹ چلیں اور الگزینڈر سلکرک کی طرح اپنے ویرانوں سے پوچھیں"

Oh, Solitude where are thy charms?

"آؤ ذرا اپنے ویرانوں میں حسن ہی تلاش کرتے پھریں۔ بخدا زندگی میں پہلی بار میں لائبریری سے اداس اور خالی لوٹا۔

میں نے امریکہ جیسے رجعت پسند ملک کی جیلوں کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہاں جیلوں میں قیدیوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے یا پھر انہیں انسان بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے لئے اچھی زندگی آموز کتابوں والی لائبریریوں کا انتظام ہے انہیں اصلاحی فلمیں دکھائی جاتی ہیں تاکہ ایک بار وہ جیل سے نکلیں تو دوبارہ پھر ادھر آنے سے باز رہیں —— امریکی حکومت جیسی انسان دشمن حکومت تک کم از کم بظاہر تو اپنی جیلوں کو اصلاح گھر میں ڈھال رہی ہے۔ مگر وطنِ عزیز کی جیل ——!

یہ شاید مجرموں کے لئے اصلاح گھر نہیں۔ بلکہ ایک تربیت گاہ ہے۔ جہاں مجرم جرائم کی تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔

وقت گزارنے کے لئے میں اور علوی اس گروپ میں جا بیٹھے، جہاں محمد مکرانی، پی پی، شریف خان، علی محمد اور ایک نیا قیدی بیٹھے چرس کے دم لگا رہے تھے نئے قیدی سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ اس کے بعد نئے قیدی نے پھر اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"اچھا تو محمد بھائی بات یہ ہوئی کہ میں نے پہلے تو ونٹی لیٹر کا تختہ اکھیڑا اور ٹارچ منہ میں پکڑ کر دکان میں آہستہ سے داخل ہوا۔ سارا کیش اٹھا کر جب میں مڑا تو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے پیچھے کا دروازہ نہیں کھولا۔ تاکہ مجھے بچ نکلنے میں آسانی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سامنے سے چوکیدار اور پولیس داخل ہوئی

مجھے بھاگنے کے لئے کوئی راستہ نہ ملا۔"

بری نے کہا۔

"ارے بیوقوف، تو ونٹی لیٹر میں سے کیوں داخل ہوا۔ میں نے بھی اسی دکان میں سات بار چوری کی۔ لیکن میں ہمیشہ شوکیس کی بازو والی کھڑکی سے اندر جاتا رہا ہوں۔ تو بھی اگر اس کھڑکی سے اندر جاتا تو پھر تیرا پکڑا جانا مشکل تھا کیونکہ اس کھڑکی کے پاس جو الماری ہے۔ آدمی اس کے پیچھے چھپ کر سارا کیش آسانی سے نکال لیتا ہے۔"

نئے قیدی نے کہا۔

"ارے ہاں ٹھیک ہے مگر اس وقت یہ بات مغز میں آئی ہی نہیں یار بری استاد۔ جب سے تو جیل میں ہے ہم تو بس یتیم ہو گئے ہیں اب ہمارا کوئی سرپرست اور بہی خواہ نہیں ہے۔ جانے تو کب چھوٹے گا۔ ہزاروں شاگرد تیرا انتظار کر رہے ہیں۔"

بری نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "بیٹا اب تو اپنی خیر منا۔ اپنی ! میرے چھوٹنے کی فکر نہ کر۔ ہاں البتہ یہاں تجھے ایک ایک مالدار گھر کا پتہ اور اس میں داخل ہونے کے راستے وغیرہ سب کچھ بتاؤں گا۔ تو مطلق فکر نہ کر۔ ایسا مانجھ کر تجھے باہر نکالوں گا کہ بس پولیس تک عش عش کرتی رہ جائے گی۔ لیکن دیکھ استاد بری کے نام کو کبھی بٹہ نہ لگانا ـــــ"

دوپہر تک بری نئے قیدیوں کی ٹریننگ کلاس لیتا رہا اور کوئی تین بجے کے قریب سپاہیوں جابیوں کا گچھا ہلاتا ہوا آیا اور بولا۔

"چلو رے چلو ـــــ اپنی اپنی کھولی پکڑو۔"

میں نے شریف خان سے کہا۔

"شریف بھائی، یہ سپاہی اندھا تو نہیں ہو گیا۔ ابھی شام بڑی دور ہے۔"

شریف خان نے کہا۔

"نہیں جلیس صاحب! اتوار اور چھٹی کے دن جیل بہت جلد بند ہو جاتی ہے۔ آج تو ساڑھے تین بجے ہی اندر دڑنا پڑے گا۔ آؤ آؤ چلو، اپنے کمبل اٹھاؤ۔"

قفل کھڑکھڑائے اور پھر پندرہ گھنٹوں کے لئے ہم ایک تنگ سی کھولی میں جکڑ دیئے گئے۔

(۹)

اگلے دن سہ پہر کے قریب جیل کا سہگل، رمضان جو جماڈی میں کام کرتا تھا. قیدیوں کی ایک فہرست لے کر ہماری بارک میں داخل ہوا اور زور زور سے نام پکارنے لگا۔

خیر الدین

سید علی

بشارت اللہ

"یہ نام کس لئے پکارے جارہے ہیں؟"

بہری نے مجھے بتایا کہ ان قیدیوں کی "ملاقات" آئی ہے۔ یعنی ان کے عزیز و اقارب آج شام ان سے ملنے آئیں گے ـــــ میں بڑے غور سے فہرست

سنتا رہا۔ رمضان نے کوئی ڈیڑھ دو سو نام پکار ڈالے۔ مگر ان میں میرا نام کوئی نہیں تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ سے کوئی ملنے نہیں آئے گا۔ مجھے پھر بھی کسی نہ کسی کا انتظار تھا۔ رمضان کے فہرست ختم کرنے کے بعد مجھ پر بڑی بھیانک سی اداسی اور مایوسی کا عالم طاری تھا ـــــ اتنے دن ہوگئے نہ جانے میری بیوی اور بچوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ بمبئی سے کراچی تک سمندری جہاز کے سفر کے باعث ان سب کی طبیعتیں خراب ہوگئی تھیں۔ ننھی شیر خوار زبیدہ تو سخت بخار میں مبتلا تھی۔ جانے اس اجنبی شہر میں ان پر کیا کیا کچھ بیت رہی ہوگی۔ میں یہاں ایک بے رحم اور سفاک قانون کے پنجے میں بالکل بے بس، لاچار اور مجبور ہو کر رہ گیا ہوں۔ کبھی کبھی جب یاسیت کا بوجھ وزنی اور ناقابلِ برداشت ہوجاتا تو جی چاہتا کہ دیواروں اور سلاخوں سے سر ٹکرا کر خودکشی کر لوں مر جاؤں ـــــ لیکن اس وقت دنیا کے سب سے بڑے آدمی کا ہیولا میرے قریب آتا اور پیار سے میرے کندھے تھپک کر کہتا ـــــ انسان کو غلامی سے آزاد کرانے والے جہاد میں ہمیں بھی ایسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہمیں بھی ایسے حالات سے سابقہ پڑا ہے استبدادی قوتوں نے ہماری محبتوں کو بھی اسی طرح ہم سے جدا کیا تھا۔ ہماری محبتوں کے جنازے اسی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرے تھے۔ لیکن جو دل انسان سے محبت کرتا ہے۔ وہ ظلم سے کبھی نہیں ڈرتا۔ جو قدم سچی منزل کی طرف اٹھتا ہے وہ نہ تو کبھی ڈگمگاتا ہے اور نہ پیچھے لوٹتا ہے ـــــ!

——— دنیا کی بوڑھی تاریخ اپنے ساتھ سوانح عمریوں کی سہیلیاں لئے میرے قریب آکر مجھے تسلیاں دینے لگی کہ تم مرد ہو۔ تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے پھر تاریخ کی بڑھیا اپنی سہیلیوں میں سے ایک ایک سوانح عمری کا تعارف کراتے ہوئے بولی۔

"دیکھو، یہ بھی تمہاری فاطمہ کی طرح مظلوم رہی ہیں، ان کے محبوبوں کے ساتھ بھی استبدادی قوت نے ہمیشہ ظلم کیا۔ لیکن وہ ظلم کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اور آج دیکھو کہ میری ساری سہیلیاں، یہ ساری سوانح عمریاں دنیا میں کتنی عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ حوصلہ کرو، کل تمہاری فاطمہ بھی تمہاری سوانح عمری بن کر حیاتِ جاوداں حاصل کرلے گی۔"

چار بجتے بجتے خوش گلو رمضان پھر ہماری بارک میں آیا اور جن جن قیدیوں کے نام اس نے پکارے تھے ان سب کو ساتھ لے کر جیل کے بڑے پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ میں ان خوش قسمت لوگوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جن کی روز روز پتھروں، اور لوہے سے ٹکرانے والی نظریں آج اپنے پیاروں کی ملائم نظروں سے ملیں گی ——— میں بڑے تکلیف دہ خیالات کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا کہ اچانک جماڈی کا مقدم شاہ جی بارک میں آیا۔ شاہ جی سے میری ملاقات جیل میں آنے کے دوسرے ہی دن ہوئی تھی۔ یہ بھی شریف خان کی طرح میرے جگری دوست آغا شورش کاشمیری کا کبھی "ہم مجلس" رہ چکا تھا اور اسی لئے اس کی میری واقفیت اسی دن دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی مقدم شاہ جی کسی زمانے میں خاکسار تحریک سے وابستہ تھا اور جیل جا چکا تھا ———

شاہ جی نے مجھے دیکھ کر آواز دی۔

"آؤ جی جلیس صاحب۔ چلو سیفٹی جیلر آپ کو بلاتا ہے۔ آپ کی ملاقات آئی ہے۔"

ملاقات ——— خوشی سے تنفس تیز ہو گیا اور میں خوشی کے مارے پنجابی میں پوچھنے لگا۔

"سچ کہندے ہو شاہ جی۔ ایمان نال دسّو۔ سچ مچ میری ملاقات آئی اے ——— ؟ چلو، فیر چھیتی نال چلو۔ میں بالکل تیار آں۔"

میں مسرت سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ شاہ جی کے ساتھ چلا۔ جیل کے بند آہنی پھاٹک کے اندرونی طرف پیٹھ لگائے ملاقات کے منتظر قیدیوں کی ایک لمبی قطار بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی کسی قیدی کا نام پکارا جاتا، سیاہ آہنی پھاٹک کا چھوٹا سا بغلی دروازہ کھلتا اور وہ اندر چلا جاتا۔

میں جب اس آہنی پھاٹک پر پہنچا تو بغلی دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ میں چونکہ سیفٹی قیدی تھا۔ اس لئے مجھے بغیر تعرض کے اندر جانے دیا گیا۔ سیفٹی جیلر کے کمرے میں جیل کے باہر کھلنے والی آہنی سلاخوں کی ایک بڑی اور چوڑی کھڑکی تھی۔ جہاں ملاقات کے منتظر ہر قیدی کو بلایا جاتا اس کے

عزیز و اقارب باہر سے اس کھڑکی پر جمع ہو کر اسے دیکھتے، روتے، باتیں کرتے
اس کو بھل دیتے۔ پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے لوٹ جاتے۔

میرا قیدی دوست شریف شاکر جو بہاڑی منشی کہلاتا تھا۔ وہاں کھڑا
قیدی کا نام پکارتا۔ قیدی ڈپٹی جیلر کے کمرے کے دروازے پر رک جاتا۔ سپاہی
اس کے جوتے اتروا دیتا گویا جیلر کا کمرہ کوئی مقدس عمارت ہے۔ پھر وہ اندر داخل
ہوتا۔ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اپنے پیاروں کو نظر بھر کر دیکھنے کی اور جی بھر کر
باتیں کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن یہ گفتگو ٹرنک کال ٹیلی فون کی گفتگو کی طرح مختصر
ہوتی اور قیدی کے ہاتھوں میں منجن کی شیشی، صابن، نارنگی، کیلے اور محبت کے
ایسے ہی چھوٹے چھوٹے تحفے لے کر لوٹ جاتا۔

ڈپٹی جیلر نے شریف شاکر سے کہا۔

"ابراہیم جلیس کے ملاقاتیوں کو اندر بلا بھیجو۔"

میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ چلو مجھے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر چند
لمحوں کے لئے تو گفتگو نہیں کرنی پڑے گی۔ بلکہ کچھ اطمینان سے باتیں ہو جائیں گی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کون کون آئے ہیں اور میں کیا کیا باتیں کروں
گا کہ اندر میرے ہمدرد مہربان اور بزرگ دوست سلیمان خان، قاضی عزیز الدین
حیفن اور خواجہ معین الدین غالباً عمداً مسکراتے ہوئے آئے۔ تاکہ ان کی مسکراہٹ
سے یہ پتہ چلے کہ باہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، باہر کوئی فکر اور تشویش کی

بات نہیں ہے۔ میرے جیل میں ہونے کے باوجود باہر مسکراہٹ ہے۔ ان تینوں
نے جو عمر میں اور تجربے میں مجھ سے بڑے ہیں۔ مجھ سے بڑی مشفقانہ اور حوصلہ افزا
باتیں کیں۔ جب میں نے فاطمہ اور بچوں کے بارے ان سے پوچھا تو انہوں نے
بتایا کہ فاطمہ کو ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ تم گرفتار کر لئے گئے ہو۔ بلکہ یہ کہا گیا
ہے کہ جب تک شاہ ایران پاکستان میں رہیں گے۔ حکومت نے جلیس کو ایک
گھر میں چھپا دیا ہے۔ بس پانچ چھ دن میں وہ آجائیں گے۔

معین نے کہا ——— "جب تک میں، عزیز بھائی اور سلیمان خان صاحب
اس دنیا میں زندہ ہیں۔ ہم اپنی بھابی اور اپنے بھتیجوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونے
دیں گے۔ ہم قرآن شریف کی قسم کھا کر وعدہ کرتے ہیں کہ تم کوئی فکر نہ کرو ———
تم خود سمجھدار ہو۔ تم اپنے آپ کو سمجھا سکتے ہو۔

میں نے پوچھا۔

"میری منجھلی بچی سخت بخار میں مبتلا تھی۔ اس کا کیا حال ہے؟"

عزیز بھائی نے جواب دیا۔

"دونوں کا علاج ڈاکٹر یٰسین زبیری صاحب مفت کر رہے ہیں اور
بے چارے بڑی ہمدردی سے دونوں کی تیمار داری کر رہے ہیں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دونوں کون ——— بیمار تو صرف زبیدہ تھی۔"

معین نے چھپانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"جس دن سے تم یہاں آئے ہو۔ بھابی بھی نمونیہ میں مبتلا ہے ——— لیکن اب ٹھیک ہو چکی ہیں۔"

میں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن جب میری نظروں کے آگے زبیدہ کا ننھا خوبصورت چہرہ بخار سے سرخ اور تمتمایا ہوا نظر آیا تو میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے سیفٹی جیلر سے کہا۔

"میں جس دن جیل آیا تھا میرے ساتھ چاکلیٹ کا پیکٹ اور ایک ٹافی کا ڈبہ تھا اگر آپ اجازت دیں تو وہ میں گھر بھجوا دوں۔"

سیفٹی جیلر ایک نہایت شریف آدمی تھا۔ اس نے اجازت دے دی اور شریف شاکر اسٹور سے چاکلیٹ کا پیکٹ اور ٹافی کا ڈبہ لے کر آیا اور میں نے عزیز بھائی سے کہا۔

"آپ یہ دونوں مٹھائیاں میرے بچوں کو دے دیجئے۔ اور یہ کہئے کہ میں نے ابھی ابھی خرید کر ان کے لئے بھیجا ہے اور میں بہت جلد آنے والا ہوں بہت جلد بہت جلد آنے والا ہوں ———"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ——— اور بس آپ لوگ چلے جائیے۔ فوراً چلے جائیے۔ اب پھر کبھی نہ آئیے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس ملاقات سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، جو کچھ ہونے والا ہے۔ وہ ہوگا۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہونے دو

اور جاؤ ——— یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ لوگ بڑی حیرت سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن وہ تینوں چونکہ میرے بچپن سے میری جذباتی اور متلون طبیعت سے واقف تھے اس لئے چند تسلی کی باتیں کر کے چلے گئے۔

اچانک میری نظر سامنے کھڑکی پر کھڑے ہوئے قیدی پر پڑی باہر اس کی بیوی کھڑی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کی تین سالہ ننھی بچی نے سلاخوں سے اپنا ننھا ہاتھ بڑھا کر اس کی قمیص کا کالر مضبوطی سے پکڑ لیا اور چیخ رہی تھی۔

"بابا ——— بابا ——— بابا ———!!"

سپاہی قیدی سے کہہ رہا تھا۔

"چل بے چل۔ بہت دیر ہو گئی۔ تیرا وقت ختم ہو گیا۔ سالے اتنی ننھی بچی کے ہاتھ سے اپنی گردن نہیں چھڑا سکتا۔"

بھلا ایک وردی پوش سپاہی کو کیا معلوم کہ یہ ہاتھ ننھی سی بچی کا کمزور ہاتھ نہیں بلکہ یہ محبت کا مضبوط ہاتھ ہے۔ جس کے پنجے سے دنیا کا طاقت ور سے طاقت ور پہلوان بھی اپنے آپ کو نہیں چھڑا سکتا۔ یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اتنا لمبا تڑنگا شخص ایک ننھی سی بچی کی گرفت میں کتنا بے بس اور مجبور نظر آ رہا تھا۔ یہ محبت کی طاقت نہیں تو اور کیا ہے ——— !

جب قیدی اپنی بچی کی گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکا۔ تو سپاہی کا بے رحم
ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے ننھی سی بچی کا ہاتھ پکڑا اور زبردستی چھڑا کر الگ کر د
قیدی روتا ہوا اپنی ویران اور اندھیری کھولی کی طرف لوٹ گیا۔

میں ابھی سیفٹی جیلر کے کمرے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سپاہی ایک
قیدی کو پکڑ کر جیلر کے سامنے لائے۔ اس قیدی کی کورٹ میں تاریخ پیشی تھی اور
ابھی ابھی کورٹ سے واپس لایا گیا تھا لیکن جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے
جوتے کے پھٹے ہوئے تلے سے ایک سیر چرس اور دو روپیہ کا نوٹ برآمد کیا گیا تھا

قیدی نے اعتراف کر لیا کہ جب اسے کورٹ کی لاک اپ میں بند کیا گیا
تھا تو اس کا بھائی وہاں اس سے ملنے آیا اور اسے یہ دونوں چیزیں دے دیں۔

قیدی دو روپے کا نوٹ اس لئے لایا تھا کہ اندر کسی سپاہی کو رشوت
دے کر باہر سے اور چرس منگوائے ـــــ سیفٹی جیلر نے حکم دیا کہ اسے تین
روز کے لئے کھولی بند کر دو۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہ کھولو۔

سپاہی قیدی کو باہر لے کر چلے گئے۔ میں بھی سیفٹی جیلر کے کمرے سے باہر
نکلا تو دیکھا کہ جن قیدیوں کی ملاقات ختم ہو چکی تھی وہ اپنے اپنے عزیز و اقارب
کے دیئے ہوئے پھل وہیں بیٹھے بیٹھے کھا رہے ہیں اور ایک قیدی اور گیٹ
جیلر میں تکرار ہو رہی ہے۔ قیدی کہہ رہا تھا۔

"یہ سارے پھل میں اپنی کھولی پر لے جاؤں گا۔ وہاں کھاؤں گا۔"

گیٹ جیلر کہہ رہا تھا۔

"نہیں تو ایک پھل بھی اندر نہیں لے جا سکتا تجھے سب کچھ یہیں کھانا
پڑے گا۔"

قیدی کہہ رہا تھا۔

"اتنے بہت سے پھل میں اسوقت کس طرح کھا سکتا ہوں۔"

میں نے گیٹ جیلر سے پوچھا۔

"کیوں جناب، پھلوں کے اندر لے جانے میں کیا قباحت ہے۔ یہ تو
کھانے کی چیز ہے۔"

گیٹ جیلر نے بڑی رعونت سے پوچھا۔

"تم کون ہو' دخل دینے والے، جاؤ اندر!"

مجھے بھی غصہ آگیا میں نے کہا ـــــ بکواس نہ کرو ـــــ یہ قیدی
بلابر پھل اندر لے جائے گا۔ دیکھتا ہوں کون روک سکتا ہے۔"

اس شور سے سیفٹی جیلر باہر آگیا۔ وہ چونکہ ایک تعلیم یافتہ اور شریف
آدمی تھا اس نے بیچ بچاؤ کیا اور مجھ سے کہا۔

"دیکھئے، اے اور بی کلاس قیدیوں کو اپنے فروٹ اندر لے جانے
کی اجازت ہے۔ سی کلاس کے قیدی یہ فروٹ اندر نہیں لے جا سکتے ـــــ"

"اس کی وجہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"جیل میں اے اور بی۔ سی کلاس کی تقسیم کیوں کرتے ہیں۔ یہاں تو سب قیدی ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی لعنت کیا یہاں بھی مسلط رہے گی؟"

سیفٹی جیلر نے مجھے سمجھایا۔

"اکثر قیدیوں کے ملاقاتی ان فروٹ میں چرس، بھنگ اور افیون چھپاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک قیدی کا ملاقاتی اس کے لئے بہت سا بھنا ہوا گوشت دے گیا تھا جس میں ایک بکرے کی نلی سے چرس کی گولی برآمد کی گئی تھی۔ یہ احتیاط اسی لئے کی جاتی ہے۔"

معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ میں بغلی دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ سامنے میں نے دیکھا ایک قیدی اپنے پھل پودے نہ کھا سکا۔ ایک پپیتا، دو کیلے، ایک سیب دو نارنگیاں وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے بچاتے ہوئے فروٹ جمع کر رہا تھا تھیلی میں ڈال دیئے۔ جس میں وہ قیدیوں کے بچائے ہوئے فروٹ جمع کر رہا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر میں سیفٹی جیلر کے اس جملے کا مفہوم اخوب اچھی طرح سمجھ گیا کہ "یہ احتیاط اس لئے کی جاتی ہے" ـــــ اب پوری طرح یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ یہ احتیاط کس لئے کی جاتی ہے ـــــ!!

بغلی دروازہ کھلا۔ باہر کی دنیا سے چند لمحوں کے لئے جو تعلق قائم ہوا تھا۔ وہ ایک خواب کی طرح ٹوٹ گیا۔ عزیز بھائی، معین اور سلیمان خان صاحب خواب کے کرداروں کی طرح نورانی دھندلکے میں غائب ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ آدمی صرف سوتے ہوئے، صرف نیند ہی میں خواب نہیں دیکھتا۔ بلکہ جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھتا ہے۔

ـــــ اور ـــــ اور قیدیوں کی ملاقات جاگتے کا ایک خواب ہوتی ہے۔

ـــــ یہ ملاقات خواب ہی کی طرح عارضی اور بے مصرف ہوتی ہے بلکہ خواب بھی شاید اس سے زیادہ دیرپا اور سہانا ہوتا ہو گا۔

جب میں کھولی میں بند کر دیا گیا۔ تو جانے کیوں مجھے ساحر لدھیانوی کا قطعہ یاد آیا۔ اور میں بڑی دیر تک گنگناتا رہا کہ ؎

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

(۱۰)

اگلے دن صبح کے کوئی پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے کہ اچانک جیل کا الارم بجنے لگا۔ ہم سب جاگ پڑے۔ جب ہمیں کھولا گیا تو ہمیں پتہ چلا کہ ہماری جان پہچان کا ایک قیدی محمود جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں پکڑا گیا۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ محمود نے ایسا کیوں کیا اس لئے کہ ہمیں اور خود محمود کو یہ معلوم تھا کہ آج ساڑھے نو دس بجے تک وہ رہا کر دیا جائے گا اس کی مدّتِ قید ختم ہو چکی تھی اور عدالت سے کل ہی اس کا پروانۂ رہائی جیل کے دفتر میں پہنچ چکا تھا ـــــ آخر دو تین گھنٹوں کی دیری سے کیا فرق پڑ جاتا تھا جبکہ پورے تین سال اس نے اس جہنم میں گزارے تھے۔ دو تین چار گھنٹے اور بھی کاٹ لیتا۔ اس بے صبری کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

میں، ببری، شریف خان، محمد مکرانی، چندر کمار اور علوی کے درمیان بیٹھا اس واقعہ سے متعلق انسان کے شوق رہائی اور جذبۂ آزادی پر ایک مفصل اور مبسوط تقریر کرنا چاہتا تھا کہ ببری بول اٹھا۔

"ارے بابا صاحب۔ رہنے دو، بس رہنے دو، لعنت کیا چھانٹتے ہو ادھر ـــــ وہ مہا مود سالا کالا ٹوپی ہے، کالا ٹوپی!"

کالا ٹوپی! شریف خاں نے مجھے بتایا کہ کالا ٹوپی وہ ملزم یا مجرم ہوتا ہے جسے بڑی لمبی سزا ملتی ہے اور جو چھوٹنے کے بعد پھر اور بار بار جیل آتا ہے۔

ببری نے چرس کا ایک لمبا دم لے کر کہا۔

"مہا مود نے کل ہی سالا ہم کو بولا تھا کہ وہ چھوٹنا نہیں چاہتا۔ وہ بولتا تھا۔ ابی باہر جا کر ہم کیا کریں گا۔ باہر کام نہیں ملتا۔ روٹی نہیں ملتا اور سالے نے جو عورت رکھا ہوا تھا وہ بھی کدھر بھاگ گئی سالی ـــــ"

میں نے پوچھا۔

"اب پھر محمود کا کیا ہو گا؟"

ببری نے کہا۔

"اسے مجسٹریٹ کے پاس پیش کیا جائے گا اور چھ مہینے سجا لگیں گا ـــــ کیونکہ جیل سے بھاگنے کی سجا کم سے کم چھ مہینہ ہے۔"

میں یہ بات سُن کر دنگ رہ گیا اور تعجب سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے

بری کو دیکھنے لگا تو بری نے کہا۔

"بابو! ایں طرح انکھاں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتا ہے جہاں مو د ہو یا ہم لوگ، ہمارا گھر تو بس جیل ہے، ایں طرح انکھاں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے تو باہر کی دنیا کو دیکھ جو ہمارے لئے جیل سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت کا جگہ ہے ——— ادھر میں تو اپن کو بڑا آرام ہے۔"

بری نے اپنی بات ختم کر دی تھی لیکن اس کا جملہ میرے کانوں میں صدائے بازگشت کی طرح بار بار گونجتا ہی رہا کہ ——— "اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے تو باہر کی دنیا کو دیکھ" ——— لیکن یہی جملہ بری جیسے اَن پڑھ جاہل اور اجڈ کی زبان سے ادا ہو سکتا ہے۔ یہ جملہ تو کسی تعلیم یافتہ آدمی، کسی مفکر، کسی فلسفی اور کسی ادیب کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ایسا تو امریکی ترقی پسند مصنف ہاورڈ فاسٹ نے اس وقت کہا تھا جب وہ جیل جا رہا تھا۔ میں ایک بڑی جیل سے نکل کر چھوٹی جیل جا رہا ہوں۔

حیرت کے ساتھ ساتھ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی کہ آج باہر کی دنیا اور سرمایہ داروں کی دنیا کے بارے میں سارے انسانوں کی رائے میں کتنی یک رنگی اور مشابہت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ آج امریکہ کا ایک عالی دماغ ادیب یا پاکستان کا ایک جاہل اُجڈ غنڈہ دونوں سرمایہ داروں کی دنیا کے بارے میں متفق الرائے ہیں کہ یہ دنیا انسانوں کے لئے ایک قید خانہ ہے۔

باوجود اس کے کہ بری کے جملے سے مجھے یاسیت کی بو محسوس ہو رہی تھی اور وہ جہالت کے باعث اسی پرانے اور شاعرانہ تخیل میں اُلجھا ہوا تھا کہ گوشے میں قفس کے آرام بہت ہے" ——— لیکن اسی یاسیت کی اوٹ سے مجھے رجائیت کا چہرہ بھی جھانکتا نظر آ رہا تھا۔ اسی یاسیت کی راکھ میں مجھے سرمایہ داروں کی دنیا سے نفرت کی چنگاریاں بھی دہکتی نظر آ رہی تھیں اور بری کے چہرے پر دنیا سے نفرت اور بیزاری کی شکنوں کو دیکھ دیکھ کر یہ بھی گمان ہوتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ بری نفرت کے نقطۂ عروج تک پہنچ جائے گا اور بری کے مضبوط ہاتھ بڑی اور چھوٹی دونوں جیلوں کو توڑ دیں گے۔ ڈھا دیں گے اور نیست و نابود کر دیں گے۔ اور پھر یہ بری اور سارے بری آزاد ہو جائیں گے۔

بری ان پڑھ اور جاہل ہونے کے باوجود مجھے انسان کی روز افزوں ترقی پسند اور سیاسی شعور کا ایک نمونہ نظر آ رہا تھا ——— یہ بری نہیں ہے بلکہ عام انسانوں کا شعور ہے جو ابھی جاہل ہے لیکن جاگ پڑا ہے۔ بیدار ہے اور بیداری خود بھی تو بجائے خود ایک علم ہے۔

اس وقت ایک سیاہ فام قیدی مستانہ ہمارے بارک میں آیا جس کو عمر قید کی سزا ہے وہ ۱۷ برس کی عمر میں ایک قتل کر کے جیل آیا تھا۔ اب

"میرے کو تو معلوم تھا کہ مہا تو د جیل سے نہیں جانا چاہتا۔ کل میرے
سامنے وہ پہلے ہی کو بولتا تھا کہ صبوں کو ہم چپکا چپی بھاگنے کی کوشش کریں گا
تم بیٹھی مار کر ہمارے پیچھے دوڑو اور ہم کو پکڑ لو۔ ہم پھر ادھر چھ مہینے مجا
کریں گا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے مستانہ سے پوچھا۔

"مستانہ! کیا تمہارا جی کبھی یہ نہیں چاہتا کہ تم اس جیل سے باہر نکلو
اور مزے کی زندگی بسر کرو۔"

مستانہ نے جذبات سے بالکل عاری کھُرے چہرے سے جواب دیا۔

"نیں بابو۔ کب بی نیں۔ اس جیل نے ہم کو اٹھارہ سال سے اپنی
گود میں پالا ہے۔ ہم اس سے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ ہم یہاں سے صرف
قبر کی گود میں سوئے گا اور کہیں نیں جائے گا۔"

مستانہ کے اس جواب سے مجھے پتہ چلا کہ زمین و مکان کا انسان کی
زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ محمود تو خیر اس لئے باہر نہیں جانا چاہتا کہ باہر اسے
کام نہیں ملتا۔ روٹی نہیں ملتی۔ اور پھر اس کی عورت بھی کہیں بھاگ گئی تھی لیکن
یہ مستانہ تو اس سے بھی دو قدم آگے نکل گیا۔ وہ کسی مالی، معاشی اور اقتصادی
مجبوری کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ وہ مکانی رفاقت اور جگہ کی محبت سے قطع
تعلق نہیں کرنا چاہتا۔ جیل کی دیواروں کے سائے میں اٹھارہ طویل برس گذارنے

اس کی عمر ۴۳ برس ہے۔ لیکن ان اٹھارہ برسوں کے درمیان میں اس نے ایک بار
بھی باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ وہ باہر کی دنیا کو تقریباً تقریباً بھول چکا تھا۔ ان
اٹھارہ برسوں میں دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ مستانہ اس سے بالکل واقف نہ تھا۔
حتیٰ کہ وہ جس جیل میں رہتا ہے وہ بھی ایک حکومت کے قبضہ سے نکل کر دوسری
نئی حکومت کے قبضے میں آگئی تھی۔ لیکن مستانہ نے صرف سنا ہی سنا تھا کہ پہلے
وہ برطانوی ہندوستان کی جیل میں تھا۔ اور اب پاکستان کی جیل میں ہے۔ اس
نے صرف ان حکومتوں کے جھنڈے دیکھے جو جیل کے دفتر کی اونچی عمارت پر
لہرائے تھے۔ پہلے اس جیل پر یونین جیک لہراتا تھا اب اس جیل پر ہلالی
پرچم!

مستانہ نے باہر کی بدلی ہوئی دنیا کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔
اور شاید دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

مستانہ بیری کی ران پر ایک زوردار ہاتھ مار کر اس کے بازو پر بیٹھ گیا۔
اور اس کے ہاتھ سے چرس کا چلم چھین کر ایک زوردار کش لگایا۔ شریف
خاں نے کہا۔

"بیری۔ مستانہ بھی جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کیا کم ہے۔ وہ محمود
کے بارے میں بہت کچھ بتائے گا۔"

مستانہ بغیر کسی اصرار کے بولا۔

کے بعد اسے جیل سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ جیل شاید اسے چھوڑ دے مگر
وہ جیل کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بفرضِ محال اگر اسے آزاد بھی کر دیا جا
اور وہ جیل سے باہر بھی رہے تو وہ جہاں بھی رہے گا قیدی ہی رہے گا۔ بالکل
اسی طرح جس طرح ہماری قوم کے بڑے بڑے رہنما انگریزوں کی ڈیڑھ سو سال
غلامی سے آزاد ہونے کے باوجود ابھی تک غلام ہیں۔ کل تک یہ اپنے آقاؤں
کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لئے مضطرب نظر آتے تھے۔ اب جب کہ ان کے
آقا انہیں آزاد کر کے چلے گئے ہیں تو ان کا برسوں پرانا عشقِ غلامی انہیں نئے
نئے آقاؤں کی تلاش میں ساری دنیا میں دوڑتا پھر رہا ہے۔

بارک کی آخری سیڑھیوں پر سے اچانک لیسین کے پکارنے کی آواز
"اوئے نواشکار ــــــ!"

ہم سب نے پلٹ کر دیکھا ایک نیا قیدی بارک میں داخل ہو رہا تھا
بیری، محمد مکرانی، شریف خان اور مستانہ نے اس نئے قیدی کو پہچان لیا۔ شریف
خان اٹھا اور دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ پھر باری باری بیری، محمد ا
مستانہ نے اسے گلے سے لگا کر استقبال کیا۔ نیا قیدی بڑی بے فکری بلکہ بڑی بے
حیائی سے مسکرا رہا۔ جب مصافحہ اور معانقہ کی رسمیں ختم ہوئیں تو شریف
خان نے نئے قیدی سے پوچھا۔
"اوئے تیرا خانہ خراب رحیم کے بچے ــــــ کتنی بار آئے گا۔ تو جیل

میں۔ کون سا یہ گیارھواں چکر ہے نا تیرا؟"
رحیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"واہ بیٹا ــــــ تیری دعا سے یہ تیرھواں چکر ہے۔ یاروں کا کیا۔ کچھ
معمولی آدمی سمجھتا ہے تو سالے ــــــ؟"
شریف خان نے نہایت عامیانہ لہجے میں کہا۔
"معلوم ہوتا ہے سالے، جس طرح تو جیل کے باہر بے چین رہتا ہے۔ بالکل
اسی طرح ماں کے پیٹ میں بھی بے چین رہتا ہو گا۔"
اس پر رحیم کے جواب دینے کے بجائے سبھوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور
رحیم نے تسلیم کر لیا کہ اب جواب دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے یا پھر
قہقہہ کیا ایسی بات کا جواب ہو سکتا ہے۔ بیری نے پوچھا۔
"اچھا یہ مسخری چھوڑ اور یہ بتا کہ اب کے سالے تو نے کدھر میں ڈاکہ ڈالا
تھا ــــــ؟"
رحیم نے شلوار گھٹنوں تک اٹھا کر پنڈلیوں کے بڑے بڑے بالوں کا گچھا
بناتے ہوئے بڑی بے حیائی سے جواب دیا۔
"یار ــــــ اب کے ڈاکہ نہیں ڈالا۔ ہوا یہ کہ دو مہینے پہلے جب
میں تین سال قیدی کی سزا کاٹ کر گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری چھوٹی سالی ایک دم پک
کر جوان ہو گئی۔ خوب پک کر بس آم بن گئی ہے۔ بس اپنی طبیعت تو لوٹن کبوتر

ہو گئی۔ ایک دن دوپہر میں بیوی ذرا ہمسایہ گئی تھی کہ یار نے
سالی کو "قطب کا میلہ" دکھا دیا۔ اسی اثناء میں بیوی لوٹ آئی
اور بیوی سالی سیدھا پولیس کو لے آئی۔

یہ واقعہ ایسی بے حیائی سے بیان ہوا کہ سن کر میں دم بخود رہ گیا اور
اس کو غور سے دیکھنے لگا کہ آیا یہ انسان ہے یا درندہ!

شریف خان نے کہا۔

"توبہ توبہ ـــــ حرامزادے تجھے شرم نہیں آتی۔ مجھے تو یہ واقعہ
سنتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ سور کے بچے۔ تجھے ایسا کام کرتے ہوئے
شرم نہیں آتی ـــــ؟"

سور کا بچہ رحیم اسی بے حیائی سے بولا۔

"ارے چھوڑ سالے شرم کیا چیز ہوتی ہے۔ اگر انسان میں شرم نام کو بھی
ہوتی تو عورت رنڈی ہی نہیں بنتی۔ اب جو بازار میں رنڈیاں بیٹھی رہتی ہیں وہ
بھی تو کسی کی ماں، کسی کی بہن، کسی کی بیٹی ......"

بیری نے بات کاٹ کر کہا۔

"کسی کی سالی ......"

سور کا بچہ رحیم بولا۔

"ہاں ہاں کسی کی سالی ہی تو ہوتی ہے اب تک کسی اور کی سالی سے اٹ

شنٹ ہوتا رہا ہے تو اب کی بار اپنی ہی سالی سے ہو جائے تو کیا
ہرج ہے؟"

شریف خان نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ"

سور کے بچے رحیم نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے لاحول ولا قوۃ کے بچے، تو اپنا بتا تو خود شرم والا
ہے اور یہ جو اتنے سارے بھائی لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ کیا یہ شرم
والے ہیں۔ کون یہاں اپنے آپ کو شرم والا کہتا ہے۔ وہ ذرا خم
ٹھونک کر میرے سامنے تو آئے!"

شریف خان نے اس وقت میری اور علوی کی طرف دیکھا۔ اور سور کے
بچے رحیم سے بولا۔

"ارے ہم لوگوں میں ان دونوں کو نہ ملا یہ دونوں بڑے شریف
بابو لوگ ہیں"

سور کے بچے رحیم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کون! یہ شریف بابو ہے؟ ارے یہ تو بڑا پکا زانی معلوم ہوتا ہے ذرا
اس کے ہونٹ تو دیکھ، کتنے موٹے موٹے ہیں۔ اور اس کے تو کان پر بھی بال
ہیں۔ ذرا دیکھ تو"

مجھے اس کے بے ہودہ ریمارک پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن شریف خان نے فوراً کہا۔

"سالے ان دونوں بابو لوگوں کو کچھ بولے گا۔ تو خون پی لوں گا۔ سمجھا!"

شریف خان سچ مچ غصے میں آ گیا تھا اور بری نے بھی ذرا سخت لہجے میں رحیم کو ڈانٹا۔ رحیم خان شاید شریف اور بری سے بڑا ڈرتا تھا۔ اس لئے مجھے اور علوی کو مخاطب کر کے بولا۔

"معاف کرنا جناب عالی۔ بات یہ ہے جی کہ ادھر جیل میں سب حرامی لوگ ہی آتے ہیں۔ اب مجھے کیا معلوم کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں ـــــ معاف کر دینا مجھ کو!"

میں رحیم کا بگاڑ ہی کیا سکتا تھا۔ خاموش ہونے پر مجبور تھا۔ رحیم کے معافی چاہنے کے باوجود شریف خان نے احتیاطاً ہم دونوں کا تعارف کرانا مناسب سمجھا۔

"دیکھ سالے ـــ یہ پاکستان اور ہندوستان کا بڑا دماغ والا انسان ہے۔ مضمون لکھتا ہے مضمون۔ حکومت کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا کہ سیفٹی میں پکڑ لیا گیا کراچی کے بہت بڑے اخبار کا بہت بڑا آفیسر ہے"

ـــــ "اور یہ اپنا علوی صاحب ـــــ یہ پاکستان کے سارے کلارک لوگوں کا صدر ہے، اس نے کلارکوں کی ہڑتال کرائی تھی۔ اس لئے

گورنمنٹ نے اسے اندر دے دیا۔"

حرام زادے رحیم نے ہم دونوں سے ایک بار اور معافی چاہی اور باتوں کا رخ بدلنے کے لئے ایک جمائی لے کر بری سے بولا۔

"یار، آج کل باہر جی نہیں لگتا۔ تم سب یار دوست اندر بیٹھے ہو۔ میں تو بس اکیلا مارے مارے پھرتے تنگ آ گیا تھا۔ اور رب جی سے دعائیں مانگتا تھا کہ اے رب جی مجھے بری، شریف اور محمد سے جلد ملا دے اور رب جی نے میری سن لی۔"

حرام زادے رحیم کی یہ باتیں سن سن کر مجھے بڑی وحشت ہونے لگی اور میں شریف خان کے ہاتھ سے ہفتہ وار "چٹان" لاہور کا پرانا پرچہ لے کر کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اپنے دوست آغا شورش کاشمیری کا "بوئے گل نالہ دل درد دل محفل" پڑھنے کی بڑی کوشش کی لیکن خیال سارا رحیم کی طرف تھا یہ جیل کے پرندے بلکہ انسانی شکل و صورت رکھنے والے درندے ان کو جیل ہی میں رہنا چاہئے۔ بلکہ ان انسان دشمن لوگوں کو جان سے مار دینا چاہیے۔

اس وقت میرا ہمزاد جو بڑے ٹھنڈے مزاج کا حامل ہے۔ مجھے بہت کہتا رہا کہ دیکھو جلیس اس طرح جذباتی فیصلے نہ دو۔ رحیم انسان دشمن سہی، درندہ فطرت سہی لیکن اس کا نفسیاتی تجزیہ کرو اور یہ معلوم کرو، کہ رحیم کو درندہ آخر کس نے بنایا ہے ـــــ؟ تم ان وجوہات اور اس ماحول کو بھی دیکھو جو ایک معصوم

رحیم کو درندہ رحیم بنا دیتا ہے۔ لیکن اس وقت رحیم کا غصے سے بُرا حال تھا کیونکہ رحیم نے مجھے زانی کہا تھا اور غُصّہ کے مارے میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے ہمزاد کو بھی ڈانٹ دیا۔

"شٹ اپ یو فول۔ تم ہمیشہ مجھے اس بے ہودہ طریقے سے سمجھاتے رہتے ہو۔ میں اس وقت تمہاری بکواس مطلق نہیں سننا چاہتا۔ وہ مجھے زانی کہتا ہے اور تم اس کی طرف داری کرنے آئے ہو۔ تم خود میرے جسم سے نکل جاؤ۔ کمینے۔

"بڑا آیا ہمزاد کا بچہ!"

میرا ہمزاد سہم کر رہ گیا۔

(۱۱)

ابھی محمود اور رحیم میری سوچ کے احاطے سے باہر بھی نہ نکلے تھے کہ ہمارا سنگل رمضان بارک میں آیا اور بیری کو آواز دی۔

"او جنٹلمین۔ مسٹر بی، ایل، بابل —— تجھے ایک خوش خبری سناؤں تیرا دوست بشیر واپس آ گیا ہے —— !"

کون بشیر —— بشیر دھوبی!! بشیر دھوبی تو کل صبح رہا ہوا تھا اور آج وہ واپس آ گیا واہ بھئی واہ —— ! لیکن بشیر کی واپسی پر اب مجھے کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ ہاں میں اس بات پر حیران تھا کہ اب مجھے ایسی حیرت انگیز باتوں پر کوئی حیرانی کیوں نہیں ہوتی۔ مگر ایک سوال میرے دل میں گونج گونج کر مجھ سے جواب مانگ رہا تھا کہ کیا سرمایہ داروں کے سماج میں انسان کے گوشت

قفس کے سوائے کہیں آرام نہیں ہے ۔ یا پھر انسان اتنا خوگرِ قید و بند ہو چکا ہے
کہ وہ آزادی کو بھی ایک قید کی صورت میں طلب کرتا ہے ــــــــ ؟

میرے سوال کے دونوں ہی جواب درست تھے اور میں ڈیڑھ سو سال
تک سات سمندر پار کے گورے حاکموں کی غلامی ہمالائی انسانوں کے لہو میں رچ
گئی ہے اس ڈیڑھ سو سال کے بے حد طویل عرصہ میں ہمالائی انسانوں کی ایک
پوری نسل نے آنے والی نسل کے لئے غلامی کو بطور ورثہ حوالے کیا تھا ــــــ
ہمالائی قوموں کی تاریخ ہر ورق پر یہ کہانی سناتی ہے کہ ایک ایک ہمالائی باشندہ
اپنی آئندہ نسل کے لئے سوائے مفلسی اور غلامی کے اور کوئی ورثہ نہیں چھوڑ
سکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی مفلسی پر بڑا قانع اور صابر
و شاکر نظر آتا ہے تو دوسری طرف گوشۂ قفس میں سچ مچ اسے آرام بہت ہے۔
ایک بھوکا پیٹ اور ایک زنجیر غلامی ۔ یہ اپنے اجداد کی میراث ہیں ـــــ
جس اسیرِ زلفِ افرنگ کو دیکھئے وہ زبانِ حال سے یہی کہتا نظر آتا ہے کہ خانہ
زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں" ـــــ اور بھاگ ہی جائیں گے
تو پھر جائیں گے کہاں ـــــ ؟

محمود اور رحیم اور بشیر جیسے عاشقانِ قید کے گروہ میں ہیں اپنے آپ کو
دیکھتا ہوں جو قید سے نفرت کرتا ہے اور آزادی کے لئے ہر لمحہ بے قرار ہے
تو مجھے محمود، رحیم اور بشیر اور میرے اپنے درمیان اتنا ہی فاصلہ نظر آتا ہے جتنا کہ

ایک پرانی اور نئی نسل کا درمیانی فاصلہ ہے اور یہاں پہنچ کر انسان کے جگمگاتے
مستقبل سے میری مایوسی کافور ہو جاتی ہے اور میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ آنے
والی نسل کے محمود، رحیم اور بشیر میری طرح جہالت کے اندھیرے سے نکل کر علم
کے اجالے میں آجائیں گے تو پھر ہر قیدخانہ کی دیواریں گرتی چلی جائیں گی اور ہر
زنجیر کی کڑی کھلتی چلی جائے گی۔

جب تک کسی ملک میں درسگاہیں کم ہوں گی ۔ اس وقت تک اس
ملک میں جیل خانے بہت زیادہ ہوں گے ۔ جیسے جیسے ملک میں اسکولوں کی عمارتیں
بنتی جائیں گی ۔ جیل خانوں کے ناسور ویسے ویسے غائب ہوتے جائیں گے گوشۂ
قفس کا آرام صرف اور صرف جہالت ہے اور اسی لئے محمود، بشیر اور رحیم گوشۂ
قفس میں دوڑے دوڑے چلے آرہے ہیں ....

اسی اثناء میں بشیر مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا ۔ اس کے اعزاز میں
خوشامدید کے پرجوش نعرے لگائے گئے اور رمضان نے خوشی کو نغمہ بار بنانے
کے لئے ایک گیت گانے کا وعدہ کیا ۔ شریف غار اندر سے خالی گھڑا لے آیا
جو طبلہ کی جگہ استعمال کیا جانے لگا ۔

تاک دھنا دِھن دِھن تاک ..

اور رمضان گانے لگا ۔

ــــ قانون سے قائد اعظم نے گوروں سے پاکستان لیا

اور سندھ لیا، پنجاب لیا، بنگال و بلوچستان لیا

اس گیت کی طرز بہت پیاری تھی۔ بڑی واہ واہ مچ رہی تھی۔ اب پتہ نہیں کہ رمضان اس گیت کا مفہوم سمجھ کر گا رہا تھا کہ اور سننے والے گیت کے مفہوم کی داد دے رہے تھے۔ یا صرف اس کی طرز پر واہ وا مچا رہے تھے۔ لیکن مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میرے ہموطن جاہل اور ان پڑھ لوگوں میں بھی ان ظالم گوروں سے نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہے جنہوں نے کبھی ان سے ان کے سندھ، ان کے پنجاب ان کے بنگال اور ان کے بلوچستان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اور آج انہوں نے اپنا سندھ، اپنا پنجاب، اپنا بنگال اور اپنا بلوچستان آزاد کرا لیا تھا۔ واپس چھین لیا تھا۔

آج رمضان جیسے اجڈ ان پڑھ کی زبان پر آزادی کا گیت آ گیا تھا اور کل یہ گیت اس کے دل میں اتر جائے گا اس کے دماغ میں لہرائے گا اور اسے اس گیت کا مفہوم معلوم ہو گا۔ پھر اس کی روح، اس کی اپنی روح بن جائے گی اور یہ روح بجلی بن کر کوندنے لگے گی۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ آنے والے کسی کل کے دن کوئی اور جیالا اٹھے اور ملکی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے قبضے سے ان کا اپنا سندھ، پنجاب، بنگال اور بلوچستان اسی طرح آزاد کرا لے جائے جس طرح ان کا پاکستان گوروں کے ناجائز اقتدار سے آزاد کرایا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے، یہ ایک سچائی ہے کہ وطن عزیز کے باشندے

آزادی کے راستے پر کتنے ہی پیچھے اور کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں۔ انسانی آزادی کا شعور ان کے بہت قریب پہنچ چکا ہے اور آنے والے کسی کل کے دن!

ہائے وہ آنے والا کل کا کوئی دن جب اس پوری زمین کا مالک میرے اور تمہارے جیسا ہر عام آدمی ہو گا۔

بارک کی فضا میں گیت ابھی لہرا رہا تھا کہ سیفٹی جیلر کا مقدم شاہ جی ہمارے پاس آیا اور بولا۔

"لو بھئی، میرا بلاوا آ گیا۔ شاید آج میں رہا ہو جاؤں!"

آج علوی کے وارنٹ میں درج پندرہ یوم کی مدت قید ختم ہو رہی تھی۔ علوی اسی لئے صبح سے صاف کپڑے پہن کر تیار بیٹھا تھا کہ آج اسے ایڈمنسٹریٹر کے پاس پیش کر دیا جائے گا اور شاید وہ رہا بھی ہو جائے۔ کیونکہ باہر کلرکوں کی ہڑتال ختم ہو چکی تھی اور بحوالہ ایسوسی ایٹڈ پریس صورت حال قابو میں آ چکی تھی۔

بہ حیثیت ایک دوست کے علوی کی رہائی پر مجھے خوشی ہونی چاہیے تھی لیکن میں دل میں اندر ہی اندر دعائیں مانگ رہا تھا کہ علوی رہا نہ ہو۔ جب تک مجھے رہائی نہ ملے علوی کو بھی رہائی نصیب نہ ہو۔ اس جیل میں ایک ہی دوست تو ایسا ہے کہ جس کی بدولت جیل میرے لئے مکمل جیل نہیں ہے صرف ایک چوتھائی جیل ہے۔ میری یہ خود غرضی بے حد شرمناک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن میں اس خود غرضی کا اتنا ذمہ دار نہیں۔ جتنا کہ یہ جیل کا ماحول ہے جو مجھے

چند دنوں سے مجھ پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا ہے اس ماحول میں ابھی تو صرف
خود غرض بنا ہوں اور نہ جانے رفتہ رفتہ کیا سے کیا بنتا جاؤں گا۔

علوی شاہ جی کے ساتھ جیل کے دفتر کی طرف جانے کے لئے کھڑا ہو گیا
تو شاہ جی نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"تسی وی چلو جلیس صاحب! سیفٹی جیلر نے تہانوں بھی بلاونڈا بیا اے
ہن چھیتی نال تیار ہو جاؤ۔"

میں اس اچانک طلبی پر حیران ہو گیا۔ لیکن ہر سانس کے ساتھ بجنے
والی ایک آس میرے کان میں چپکے سے کہہ گئی ـــــ شاید علوی کے ساتھ تجھے
بھی رہا کر دیا جائے گا۔ ورنہ پھر علوی کے ساتھ بلانے کے کیا معنی۔!

میں نے کہا۔ ہاں ہاں میری آس! تو شاید ٹھیک کہتی ہے۔ دل میں
خوشی کا ایک ننھا سا شعلہ بھڑک اٹھا ایک موہوم سی امید اور ایک ہلکی
سی آس پر اس طرح مچل جانا انسانی فطرت کا ایک بچپن ہی ہے۔ لیکن جیل میں
انسان کا بچپن بار بار عود کر آتا ہے۔ میں نے اسی جیل میں پچاس پچاس ساٹھ
ساٹھ سالہ بوڑھے قیدیوں کو چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے
دیکھا ہے۔ اچھے خاصے معمر قیدی چھوٹی چھوٹی معمولی معمولی باتوں پر بچوں کی طرح
ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ ہر معاملے میں ایک بچے کی طرح مجبور دلا جا
نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر کے خطرناک سے خطرناک جرائم کرنے کے بعد جب وہ جیل

میں آتے ہیں تو ان کے چہرے بالکل معصوم بچوں کی طرح گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں
جب ان کی رہائی کا دن قریب آتا ہے۔ جس دن وہ رہا ہوتے ہیں بالکل بچوں کی
طرح گھبرائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بالکل بچوں کی طرح اچھلتے کودتے ناچتے
گاتے ہنستے، قہقہے لگاتے اور خوشیاں مناتے نظر آتے ہیں۔

ـــــ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ انسان خود فطرتاً
معصوم ہے اور اکتسابی طور پر یا عادتاً گناہگار اور جرائم پیشہ ہے۔

علوی اور میں سیفٹی جیلر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سیفٹی جیلر پہلے علوی
سے مخاطب ہوا۔

"یو آر احمد علوی ـــــ؟ دیکھئے ابھی ابھی ایڈمنسٹریٹر آفس سے ٹیلیفون
احکام آئے ہیں کہ تاحکم ثانی آپ کو ایڈمنسٹریٹر کے سامنے ـــــ پیش نہ کیا
جائے ـــــ دِس اِز جسٹ ٹُو اِنفارم یُو ـــــ ناؤ یُو کین گو۔"

علوی کا چہرہ جو صبح سے رہائی کی خوشی میں دمک رہا تھا۔ اس پر جیسے غصے
اور غم کا سایہ چھا گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے چہرے پر معاً
جو کرختگی آ گئی وہ کہہ رہی تھی ـــــ لو مجھے دیکھو میں ہوں جواب ـــــ!

علوی چپ چاپ سیفٹی جیلر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے
جانے کے بعد سیفٹی جیلر نے سامنے رکھے ہوئے مراسلات میں سے دو سفید
ٹائپ شدہ کاغذ نکالے۔ ایک کاغذ اپنی فائل میں رکھا اور دوسرا میرے حوالے

کرتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کے Grounds of detention "اسباب گرفتاری" ہیں۔ اگر آپ اس کے خلاف کوئی ری پریزنٹیشن کرنا چاہتے ہیں تو مجھ سے ایک کاغذ لیجئے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک کورے کاغذ کے کونے پر اپنے چھوٹے دستخط کئے اور کاغذ میرے حوالے کیا۔ کیونکہ جیل میں کوئی قیدی بغیر اجازت اپنے پاس کاغذ کا ایک پرزہ ——— اور پنسل کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں رکھ سکتا۔ میں نے دونوں کاغذ لئے اور بڑی بے تابی سے اپنے "اسبابِ گرفتاری" پڑھنے لگا۔

آفس آف دی ایڈمنسٹریٹر آف ....

.. ..

.. .. مسمی ابراہیم حسین خاں جلیس خلف احمد حسین خاں تم نے دو ہفتہ وار اخبار "پیامِ مشرق" میں ایک مضمون بعنوانِ "پاکستان کب بنے گا" اس مقصد سے لکھا کہ ملک میں حکومت کے خلاف نفرت اور بے چینی پیدا ہو۔

تم اپنی تقریروں میں ہمیشہ اربابِ حکومت کا مذاق اڑاتے ہو اور لسانی تفریق کا پرچار کرتے ہو۔

لہٰذا اگر تم ان اسبابِ گرفتاری کے خلاف صفائی پیش کرنا چاہتے ہو تو جتنی جلدی ممکن ہو سکے محکمہ ہذا کو مطلع کر سکتے ہو۔

شرح دستخط۔ ایس ہاشم رضا

ایڈمنسٹریٹر۔ کراچی

ان "اسبابِ گرفتاری" کو پڑھ کر میں حیران رہ گیا کہ بس اتنی سی بات کو اتنی جیسے افسانہ کر دیا ——— حکومت تو مجھ سے بھی زیادہ افسانہ نگار معلوم ہوتی ہے ——— ان اسبابِ گرفتاری میں یہ سبب تو بالکل من گھڑت اور خیالی ہے کہ میں تقریریں بھی کرتا ہوں۔ سارا پاکستان جانتا ہے کہ میں صرف ایک ادیب ہوں مقرر ہرگز نہیں۔ میں نے کبھی کسی پبلک یا پرائیویٹ اسٹیج سے کوئی تقریر بھی نہیں کی۔ تقریر کرنی مجھے آتی ہی نہیں ——— میرا جی چاہتا تھا کہ خفیہ پولیس کے ان "مخبروں" کو دعائیں دوں جن کی ڈائریوں اور نوٹ بکوں نے مجھے "مقرر" بھی بنا دیا۔ میں ان احکام کے حق میں بھی دعائے خیر کرنا چاہتا تھا جنہوں نے اپنے ملازمین کی نوٹ بکوں پر آمنا و صدقنا یقین کر لیا۔

ان اسبابِ گرفتاری کو پڑھ کر میرے دماغ سے فکر و تشویش کے سارے بادل چھٹ گئے۔ میں جب سے اس جیل میں داخل ہوا تھا، سوچ سوچ کر تھک گیا تھا کہ آخر مجھ سے کون سا ایسا زبردست جرم سرزد ہوا ہے کہ نصف سرکار نے مجھے بھری پری دنیا سے اٹھا کر اس دوزخِ صغریٰ میں جھونک دیا

گیا ہے کہ لیکن اب میرے دل پر سے اتنے دنوں روز روز جمع ہوا سارا بوجھ اتر چکا
میں اب اتنا مطمئن تھا کہ اگر مجھے چھ ماہ کی بجائے برسوں کے لئے بھی اس قید
رہا نہ کیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ اب میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں مجرم نہیں
ہوں جب کوئی شخص مجرم نہ ہو اور اس کے اطراف قید و بند کی ہزار دیواریں
گھیر دی جائیں۔ تب بھی وہ مجرم یا قیدی نہیں کہا جا سکتا ــــــ اس وقت
صرف میرا جسم قید ہے۔ میری روح تو قید نہیں ہے۔

میں نے بڑے اطمینان سے اسباب گرفتاری کے خلاف جواب صفائی
شروع کیا کہ جس مضمون پر یہ الزام حیرت انگیز ہے کہ میں نے وہ "مضمون حکومت
کے خلاف نفرت اور بے چینی پیدا کرنے کے لئے لکھا تھا۔ ایسی صورت
وہ حکومت کے خلاف کس طرح ہو سکتا ہے جب کہ حکومت اپنے آپ
"عوامی حکومت" کہلوانے کی دعویدار ہے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے
خلاف خود اربابِ حکومت کی میں نے بیسیوں تقریریں اور سینکڑوں بیانات
پڑھے ہیں اس رو سے جو الزام مجھ پر عائد ہوا ہے وہ خود اربابِ حکومت پر
بھی عائد ہو سکتا ہے۔

میں ہرگز پاکستان کا مخالف نہیں ہوں۔ جس سرزمین نے مجھے ا
وقت اپنی آغوش میں پناہ دی۔ جب کہ میری زندگی پر موت کی چیل جھپٹنے
والی تھی۔ میں اس کے خلاف کبھی کوئی احسان فراموشانہ حرکت نہیں کر سکتا

میرا ماضی گواہ ہے کہ میں نے بھی اس سرزمین کی تخلیق میں حسبِ استطاعت بڑی
بڑی قربانیاں پیش کی ہیں۔ میں نے اپنے ضعیف باپ، اپنی بوڑھی ماں
اپنے پیارے پیارے بھائیوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا اور پچھلے دو سال
سے ان کی پیاری صورتیں دیکھنے کے لئے ترس گیا ہوں۔ اتنی قربانیاں پیش کرنے
کے بعد میں اس محبوب سے کیسے روگرداں ہو سکتا ہوں۔ جس کے سوائے
اب میرا کوئی بھی پیار، کوئی بھی رشتہ دار یہاں موجود نہیں۔

میرا خیال ہے کہ حکومت باغیانہ تخیل اور تعمیری تنقید میں کوئی فرق
نہیں کر سکی ہے۔ میرے اس مضمون میں باغیانہ تخیل نہیں، صرف تعمیری تنقید
ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنے مضمون کو اس نعرے پر شاید کبھی ختم نہ کرتا کہ۔
"پاکستان کو غیر ملکی آقاؤں سے تو آزاد کرا لیا گیا مگر اب اسے ملکی
سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے چنگل سے آزاد کرانا ہے۔"

عوام کا پاکستان زندہ باد۔

ہر جمہوری ملک میں تعمیری تنقید کی پوری آزادی ہے بشرطیکہ ادیبوں شاعروں
کی تنقید کو سمجھنے کا کام خفیہ پولیس کے ملازموں کے بجائے اعلیٰ تعلیم یافتہ
لوگوں کے ذمہ کیا جائے۔ کوئی جمہوری ملک تعمیری تنقید کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔

کاش! اربابِ حکومت مجھے گرفتار کرنے سے پہلے اس مضمون سے متعلق
میرے خیالات سے بھی واقف ہو لیتے اور مجھے ایک موقع دیتے کہ میں یہ جان

یوں کہ حکومت تعمیری اور تخریبی تنقید کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ اس
طرح اچانک ایک ادیب کو راہ چلتے گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دینا اس
ادیب کے لئے اتنا اذیت رساں نہیں ہے۔ جتنا کہ خود ایک جمہوری حکومت
کے لئے باعث بدنامی ہے۔

حکومت نے مجھے سزا دینے میں بھی ایک غلطی کی تھی۔ قانون کی رو سے
تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ میرا مضمون جس رسالے میں شائع ہوا تھا اس کے ایڈیٹر
پرنٹر، پبلشر کو بھی سزا دینی چاہیئے تھی۔ اس رسالے سے ضمانت طلب کی جاتی
پھر اس کی اشاعت مسدود کر دی جاتی اور لکھنے والے کو کم از کم ایک وارننگ
ضرور دی جاتی ___ لیکن رسالے کے ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر سے کسی قسم کا
تعرض نہیں کیا اور مضمون نگار کا اس بے خبری کے عالم میں گلا پکڑ لیا گیا۔

جواب صفائی سیفٹی جیلر کی معرفت محکمہ ایڈمنسٹریٹر کو روانہ کر دینے
کے بعد مجھے ایک گونہ سکون ہوا۔ ہلکی سی خوشی کی کلیاں میرے دل میں چٹک
رہی تھیں رہائی نہیں کم از کم سکون تو مجھے میسر آ گیا تھا۔ سکون اگر بجائے خود
رہائی نہیں تو کم از کم نجات ضرور ہے۔ ایک "ریفیوج" ضرور ہے۔

دن بھر میں اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرتا رہا اور رات بھی
مجھے بڑی تازگی بخش نیند میسر آئی۔ ویسے رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ
علوی چھوٹ گیا ہے اور اپنے ارد گرد تیرہ سو قیدیوں کے باوجود بالکل تنہا ہو کر
میں بے طرح گھبرا رہا ہوں۔

میں چونکہ اکثر و بیشتر سچے خواب دیکھا کرتا ہوں اس لئے میں نے سوچا اگر
علوی رہا ہو جائے اور بہت ممکن ہے کہ وہ واقعی رہا ہو جائے اس لئے مجھے کسی
باذوق قیدی سے ربط قائم کر لینا چاہیئے تاکہ جیل صرف تین چوتھائی ہی باقی رہ کر
مکمل نہ ہونے پائے۔

ان تیرہ سو انسانوں میں ضرور کوئی ایسا دوست مجھے میسر آ جائے گا ابھی
تک علوی کے سامنے ہونے کی وجہ سے میں نے اس کے پیچھے کسی قیدی پر تنقیدی
یا انتخابی نظر نہیں ڈالی تھی ___ لیکن اب میں اسے تلاش کروں گا اور
تلاش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

(۱۲)

صبح جب میں ننگ دھڑنگ قیدیوں کے ہجوم میں کھڑا نہا رہا تھا تو میرا مٹی کا وہ لوٹا جس سے میں پانی بھر بھر کر اپنے جسم پر انڈیل رہا تھا۔ ٹوٹ گیا میں نے ابھی کسی قیدی سے اس کا لوٹا نہیں مانگا تھا کہ ایک کالا بھجنگ قیدی جو صرف جانگیہ پہنے ہوئے تھا۔ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"واہ جلیس صاحب آپ نے تو لٹیا ڈبونے کے بجائے توڑ ڈالی ہے۔"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ جاہل اور ان پڑھ قیدیوں میں یہ بامحاورہ گفتگو کرنے والا شخص کہاں سے آ گیا۔ ابھی میں حیران نظروں سے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔

"آپ مجھے دیکھ کر کچھ حیران ہو گئے۔ جی ہاں۔ بات ہی حیرانی کی ہے اچھا

فی الحال میرا لوٹا استعمال فرمائیے۔ لے واللہ تکلف نہ کیجئے بندہ نواز!"

ارے یہ تو ٹکسالی زبان بھی بولنے لگا اور قیافہ شناس بھی معلوم ہوتا ہے کہ میری حیرانی کو بھی بھانپ گیا لیکن میں نے صرف "شکریہ" کہہ کر لوٹا اس سے لے لیا اور نہانے لگا۔

جب میں نہا کر تولئے سے جسم پونچھ رہا تھا تو اس نے پوچھا۔

"آپ نے شاید پہچانا نہیں مجھے ——؟"

میری حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا —— تو گویا یہ مجھے پہلے سے بھی جانتا ہے۔ میں نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

"جی — آپ — میں — میرا جہاں تک خیال ہے کہ ....."

اس نے میرا جملہ خود ہی مکمل کیا۔

"..... غالباً" میں آپ سے نرگس آرٹ کنسرن بمبئی میں ملا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟ جی ہاں بالکل ٹھیک آپ کا خیال درست ہے میں آپ سے فلم ایکٹرس مس نرگس کے فلیٹ "شاطو" واقع میرین ڈرائیو بمبئی میں ملا تھا۔ مس نرگس نے آپ سے میرا تعارف کرایا تھا۔"

مجھے دل ہی دل میں ہنسی آ گئی اس لئے کہ یہ تو ایک حد تک صحیح ہے کہ میں بمبئی میں تھا اور فلم کمپنی میں کام کرتا تھا۔ مگر نرگس آرٹ کنسرن کے بجائے

" اچھا تو غریب کو غلام حیدر ناز اکبر آبادی کہتے ہیں۔ !! خوب! غریب غلام حیدر!! تم صرف غریب غلام حیدر نہیں بلکہ عجیب و غریب غلام حیدر اکبر آبادی ہو۔"

اس دن، دن بھر غلام حیدر سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا کہ غلام حیدر ان قیدیوں میں شامل ہے جو دن بھر گورنر ہاؤس میں کام کرتے ہیں شام جب کھولیوں میں بند ہونے کا وقت آیا تو اس نے کہا۔

"آج میں آپ کی کھولی میں بند ہوں گا۔ اجازت ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

بھائی ـــــ یہ کھولی نہ میری ہے نہ تمہاری۔ ہماری کھولی میں ہر شام ایک اخلاقی قیدی بند ہوتا ہے۔ آج اس کی جگہ تم آجاؤ۔ اچھا ہے ذرا ہمارا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔

اس نے کہا۔

"اس ذرہ نوازی پر یہ کمترین آپ کی خدمت میں خلوصِ دل سے ہدیۂ تشکر ادا کرتا ہے کہ آپ جیسا عظیم المرتبت ادیب مجھ سے بات کرنے کو خوش گزران وقت سے تعبیر کرتا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ تو اتنی فصیح و بلیغ زبان میں بات کرتے ہیں کہ باوجود

اس کے کہ میں ایک مشہور ادیب ہوں۔ زبان کے بارے میں آپ کے سامنے ایک قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا ہوں آپ کچھ شاعر واعر تو نہیں ہیں ـــــ ؟؟"

اس نے اپنی زبان دانی کا مزید رعب مجھ پر طاری کرنا چاہا۔

" واعر تو نہیں البتہ شاعر ضرور ہوں ـــــ ارے صاحب شاعری کے دشت کی سیاحی میں میری تو ساری عمر گذر گئی ہے، اور یہ تو مجھے ورثے میں ملی ہے۔ حضرت نظیر اکبر آبادی کے خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ حضرت داغ دہلوی کے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ حضرت جگر مراد آبادی، حضرت جوش ملیح آبادی حضرت بہزاد لکھنوی وغیرہ میرے جگری دوست ہیں ہیں۔ دہلی، لکھنؤ اور علی گڑھ کا کوئی آل انڈیا مشاعرہ ایسا نہیں ہوگا جس میں میں نے اپنا کلام نہ سنایا ہو، آپ تو علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں نا۔ آپ نے تو مجھے خوب دیکھا اور سنا ہوگا ـــــ میں ناز اکبر آبادی تخلص کرتا ہوں۔"

ناز اکبر آبادی تخلص ـــ! میں نے حافظے پر زور ڈالنا شروع کیا۔ لیکن اس نے فوراً کہہ دیا۔

" ارے حافظے پر زور نہ ڈالئے۔ آپ تو ان دنوں لونڈے ہوں گے۔"

لونڈا ـــــــ !!! مجھے ایک لمحے کے لئے اس کا یہ بے ہودہ خطاب
بہت بُرا معلوم ہوا۔ لیکن میں نے غلام حیدر ناز اکبر آبادی کے پینتالیس پچاس
سالہ بھدے موٹے پستہ قد جسم، اس کی صاف چندیا، آنکھوں کے نیچے دو بڑے
بڑے سیاہ حلقوں، کچھ جھریاں آلود سیاہ لٹکتے ہوئے جبڑوں کو غور سے دیکھا تو مجھے
یوں محسوس ہوا جیسے پرلے درجے کا جھوٹا غلام حیدر ناز اکبر آبادی ایک بات تو کم
ازکم سچ کہہ گیا۔

میں نے کہا۔

"تو حضرت ناز۔ کوئی ایسی رومانوی اور رنگین نظم یا غزل سنایئے
جو جیل کی اس خشک اور بنجر زندگی میں میٹھے پانی کے چشمے کی
طرح بہ نکلے"۔

لیکن اسی وقت پولیس کا سپاہی چابیوں کا بڑا گچھا ہلاتا ہوا آیا اور پکارا

"اوئے غلام حیدر دے پتر۔ چل کھولی پکڑ، تیری ماں دی۔۔۔۔"

غلام حیدر نے پہلے سپاہی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف ـــــ
اس کی آنکھوں میں اچانک بڑی بے بسی، بے چارگی بلکہ ہلکے ہلکے آنسو بھی آ گئے
ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔

"ہائے قسمت! ایک شریف آدمی کو زندگی میں ایسی بھی گالیاں سننی تھیں"

مجھے غلام حیدر پر بڑا ترس آیا۔ غلام حیدر جھوٹا ہے کوئی بات نہیں

جھوٹا تو میں بھی ہوں لیکن جھوٹے کا حسب ونسب سے کیا تعلق۔ وہ یقیناً ایک
شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی پڑھائی لکھائی اور تربیت بہت
اچھی ہوئی ہے۔ وہ گفتگو کا سلیقہ اور آداب اچھی طرح جانتا ہے۔ مجھے پہلے پہل
تو اس کی ڈینگوں سے کچھ نفرت ہو رہی تھی۔ لیکن سپاہی کی ایک ہی گالی نے
غلام حیدر کے لئے میرے دل میں ہمدردی کو جگہ دے دی۔

غلام حیدر اس رات میری کھولی میں بند ہوا۔ باتوں کا سلسلہ شروع
ہوا تو علوی نے غلام حیدر سے اس کے فردِ جرم کے بارے میں پوچھا۔ غلام حیدر
بڑی دیر تک بات ٹالتا رہا کہ بتائیے۔ کیا کیجئے گا معلوم کر کے۔ نہ مجھے بیان کر
کے خوشی ہوگی اور نہ سننے سے آپ کو مسرت ہو سکتی ہے۔ سمجھ لیجئے کہ تقدیر
کا ستایا ہوا ہوں۔

لیکن جب میں اور علوی کسی طرح نہ مانے تو اس نے کہا۔

"اچھا صاحب! لیجئے تو پھر سن لیجئے اپنی رام کہانی۔ پہلے ایک
بات صاف صاف بتا دوں آپ کو۔ بے تکلفی معاف میں
آدمی ذرا رنگیلے مزاج کا ہوں چونکہ آگرے کے رئیسوں کے
خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لئے اپنا محبوب مشغلہ موسیقی
ہی ہے۔ آگرے کی ایک مشہور طوائف مشتری بائی۔ جو آگرے
ہی سے مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ محض میری خاطر کراچی چلی آئی

لیکن صاحب ہم ٹھہرے ہرجائی۔ مہینوں میں کبھی اس سے صاحب سلامت ہوگئی تو ہوگئی۔ ورنہ کچھ نہیں۔ ایک رات ہمارا جی چاہا کہ چلو مشتری کے پاس چلیں۔ اس کے یہاں پہنچے تو دیکھا کہ یہاں کے ایک بڑے رئیس بھی تشریف فرما ہیں اور مشتری کو مجبور کر رہے ہیں کہ میں ساری دولت تمہارے قدموں پر رکھ دوں گا۔ بس اب میرے گھر چل کر رہو۔ مشتری راضی بھی ہوگئی تھی۔ لیکن جیسے ہی مشتری نے مجھے دیکھا تو رئیس اعظم کا دیا ہوا سارا زیور اور روپیہ اٹھا کر پھینک دیا اور بولی۔

"معاف کیجئے نواب صاحب۔ اب میرے حیدر میاں آگئے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں خرید سکتی۔"

بس اتنی سی بات تھی۔ نواب صاحب کو بڑا جلال آگیا۔ وہ مشتری پر بڑی طرح فریفتہ تھے۔ انہوں نے قسم کھائی کہ یا تو میں اس کانٹے کو اپنے اور مشتری کے راستے سے ہٹاؤں گا یا پھر خودکشی کر لوں گا۔ اب اس نوابی قسم کا حشر دیکھئے کہ میں یہاں آپ کے پاس ہوں مجھ پر ایک فرضی فرد جرم لگا کر نواب صاحب نے مجھے اندر بھجوا دیا۔ اگر میں کراچی میں نو وارد نہ ہوتا

تو میں نواب صاحب کو اپنی بگھی میں گھوڑے کی طرح جتواتا۔"

غلام حیدر کی یہ داستان مجھے بالکل مبالغہ آمیز اور جھوٹی معلوم ہوئی نہ جانے وہ کون بدوضع اور بدذوق مشتری بائی ہوگی جو اس کالے بھتل بتھل پلپلے شخص پر اتنی فریفتہ ہوئی ہوگی مگر باوجود اس جھوٹی داستان کے غلام حیدر کی جو عزت میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی وہ کسی طرح کم نہ ہوئی۔ میں نے سوچا یہ جھوٹ بول تو رہا ہے۔ مگر شاید مصلحتاً بول رہا ہے اس سے غیر شعوری طور پر کوئی ایسا واہیات جرم سرزد ہوگیا ہے۔ جس کا وہ مجھ پر اظہار نہ کرنا چاہتا ہو۔ غلطی پر صرف شریف آدمی ہی شرماتے ہیں اور غلام حیدر بھی شرما رہا ہے ورنہ وہ بھی ایک حرام کے تنگوں کی طرح ساری بات صاف صاف سنا دیتا کہ ہاں جی۔ یہ جرم کیا ہے اور اس لئے پکڑا گیا۔ جس طرح رحیم نے بہ کمال بے حیائی سے کہا تھا کہ میں نے بیوی کی موجودگی میں اپنی نوخیز سالی کو خراب کیا ہے۔

میں یقین کرنے پر مجبور ہوگیا کہ غلام حیدر آدمی بلاشبہ شریف ہے۔

اس کے بعد غلام حیدر نے مجھے اپنے بارے میں اور بہت سی باتیں بتائیں کہ اس کے والد صاحب لکھنؤ میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں۔ انگریزوں نے خان بہادر کے علاوہ آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کا خطاب بھی دیا تھا۔ آگرے اور لکھنؤ میں ان کی دو بڑی شاندار کوٹھیاں تھیں۔ فورڈ موٹر کار فٹن نوکر چاکر بھی تھے۔ وہ اپنے والد کا اکلوتا بیٹا تھا لیکن آگرے کے فسادات نے

بے چارے کو آگرہ اور کروڑوں کی جائداد چھوڑنے پر مجبور کیا۔ وہ جب آگرے سے بھاگا تو صرف پچاس لاکھ روپے لے کر بھاگ سکا تھا باقی لاکھوں روپیہ کچھ تو بنکوں اور کچھ کاروبار میں پھنسا رہ گیا۔ پاکستان آکر اس نے ان پچاس لاکھ روپوں میں ایک آئس فیکٹری، ایک کپڑے کی دوکان اور پانچ موٹر گاڑیاں خریدیں جو کراچی سے اندرون سندھ مسافروں کو لے جاتی ہیں۔ جمشید روڈ پر اس کی ایک عالیشان کوٹھی بھی ہے۔ ایک اسٹوڈی بیکر کار ہے ـــــ غرضیکہ زندگی کے سارے عیش و آرام اسے میسر ہیں۔ آدمی چونکہ رنگین مزاج ہے۔ اس لئے شادی نہیں کی اور بقول اس کے حبیب بینک میں کافی روپیہ رکھ شادی کرنا محض حماقت ہے ـــــ اپنی رنگین مزاجی کے ضمن میں اس نے مجھے بتایا کہ فلموں سے والہانہ عشق اسے بمبئی لے گیا اور بمبئی میں اسے مس نرگس سے الفت ہو گئی آدمی رئیس تھا۔ اسی لئے نرگس اس کے کوٹ کے کالر کا پھول بن گئی۔ اس نے نرگس کو لاکھ مجبور کیا کہ فلم انڈسٹری چھوڑ دو۔ اور چلو باہر چلیں اور ساری زندگی سوئٹزرلینڈ یا پیرس میں گزاریں۔ لیکن نرگس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ وہ بڑی دیس سیوک بن گئی تھی۔ ہمیشہ کہتی تھی کہ وطن عزیز چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ تمہارے سوئٹزرلینڈ سے تو میرا کشمیر کہیں زیادہ خوبصورت ہے ـــــ رہا پیرس وہ اپنے سمندر بمبئی کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا ـــــ ایک دو بار تو وہ اپنی نسائی کمزوری سے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ بھی ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ نرگس کے

مزاج سے خوب واقف ہو چکا تھا اور خود بھی حب الوطنی کا بے پناہ جذبہ رکھتا تھا اس لئے نہ اسے سوئٹزرلینڈ لے گیا اور نہ پیرس ـــــ بلکہ نرگس کے جذبۂ حب الوطنی اور سراہتے ہوئے بولا۔ کہ میں تو صرف تمہیں آزما رہا تھا ورنہ میں تمہارے جذبات اور تمہاری فطرت کے خلاف کسی مقام پر بھی تمہیں نہیں دیکھنا چاہتا اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ نرگس الخزرات کی تنہائیوں میں اس سے کہا کرتی تھی کہ اس کو اگر کسی نے اندر سے اور باہر سے اچھی طرح دیکھا ہے سمجھا ہے وہ صرف غلام حیدر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں بھی مجھے جھوٹ معلوم ہوئیں۔ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو شاید ان باتوں پر ایمان لے آتا۔ لیکن جھوٹ بولنے میں اپنی بھی کافی مہارت ہے اور جھوٹے کی نفسیات سے کما حقہ آگاہی ہے۔ اس لئے مجھے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ اس بات میں جھوٹ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور سچ کہاں ختم ہو جاتا ہے اتنی ساری گفتگو کے دوران میں جھوٹ تو جو شروع ہوا تھا وہ ابھی تک ختم نہیں ہونے پایا تھا۔ اور سچ وہیں ختم ہو گیا تھا۔ جہاں اس نے کہا تھا کہ میرا نام غلام حیدر ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"جب آپ کا باہر اتنا بڑا سماجی درجہ ہے تو آپ کو جیل میں اے کلاس یا کم از کم بی کلاس کیوں نہیں دیا گیا۔ یہاں غالباً ہر اس شخص کو بی کلاس میں رکھا

جاتا ہے جس کی باہر کی آمدنی کم از کم تین سو روپے ماہوار ہو۔

وہ یقیناً اس سوال پر پریشان ہو گیا تھا مگر چونکہ اس کے اور میرے درمیان بڑا گہرا اندھیرا حائل تھا۔ اس لئے میں اس کا چہرہ اور اس کے تیور نہ دیکھ سکا رہا جواب دینے کا سوال تو مجھے اس کی ذہانت سے پوری پوری اُمید تھی کہ وہ کوئی بڑا اچھا سا تشفی بخش جواب ضرور گھڑ لے گا۔

"ارے بھائی صاحب ایک شریف آدمی کے لئے جیل جانا موت کے منہ میں جانے سے کسی طرح کم نہیں۔ ہم نے زندگی بھر کبھی حوالات کے پھاٹک میں قدم نہیں رکھا تھا۔ جیل تو بڑی دور رہی۔ لیکن شوئی قسمت کہ اس بلا میں پھنس گیا ہوں اور مطلق نہیں چاہتا کہ اب اپنی ذلت کا ڈھنڈورا پیٹوں۔ اگر اب میں لے یا بی کلاس کے لئے درخواست دوں تو باہر میرے ملازموں کو اور میری شراکت میں کام کرنے والے معززین کو پتہ چل جائے گا کہ میں جیل میں ہوں اس کے بعد میری کیا عزت رہ جائے گی جناب من۔ اسی لئے میں نے نہ تو مقدمہ لڑا ہے اور نہ کسی وکیل کو مقرر کیا ہے تاکہ بات دبی رہے صرف چھ مہینے کی سزا ملی ہے جس میں سے چار مہینے گزر چکے ہیں۔ اب دو مہینے بھی اسی طرح گزر جائیں گے۔ وہ بھی گزار کر چپ چاپ باہر نکلوں گا ——— آج کل میرے ملازمین اور میرے شرکائے تجارت یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں یا تو کوئٹہ چلا گیا ہوں یا پھر کوہ مری پر ہوں۔ یہ میری عادت ہے۔ میں

ہمیشہ ایسے ہی بغیر اطلاع کے کسی نہ کسی تفریحی سفر پر چلا جاتا ہوں"۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ گھڑا ہوا جواب نہیں بلکہ اس میں صداقت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہاں اس نے بڑی دیانتداری سے بڑی صاف گوئی کا ثبوت دیا ہے۔ شریف آدمی عزت کی خاطر ایسا ہی کر سکتا ہے اسکے بعد اس نے ایک لمبی جمائی لی۔ اور بولا۔

"اچھا بھئی اب سو رہیئے۔ ابھی دو مہینے آپ کا ہمارا ساتھ ہے باتیں تو ہوتی رہیں گی"۔ پھر اس نے خدا سے دعا مانگی۔

"اے شریفوں کی عزت و آبرو کے مالک ان دونوں مہینوں کے سارے دنوں کو پَر لگا دے کہ وہ جلدی جلدی اُڑ جائیں۔"

اسکے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن بڑی دیر تک میں اسکے بارے میں سوچتا رہا حتیٰ کہ خواب میں بھی میں نے کچھ ایسا دیکھا۔ جس میں غلام حیدر ایک بے حد ذلیل غنڈے کی طرح بدمعاشی کی حرکتیں کرتا رہا ——— جسکی اُلٹی تعبیر سوائے اسکے اور کیا ہو سکتی ہے کہ غلام حیدر ایک بے حد شریف اور معزز انسان ہے۔

صبح میں نے غلام حیدر کی موجودگی میں علوی سے کہا۔ "علوی اگر تم اب چھوٹ بھی جاؤ تو کوئی پرواہ نہیں اب تمہارا نعم البدل مل چکا ہے۔ ایمان سے کیا Tech ‏mashoom Pesonality ہے واللہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غلام حیدر نے کہا۔

"بندہ نوازی"۔ اور مسکراتا ہوا بنگلے کی طرف چلا گیا۔

(۱۳)

پندرھویں دن جیل کا صوبیدار سہ پہر کے قریب ہمارے وارڈ میں آیا اور مجھے دیکھ کر بڑی عزت سے آواز دی۔

"او جلیل صاحب ____ اچھے آؤ جناب!"

میں بڑا حیران ہوا کہ یہی صوبیدار جو پہلے مجھے "ابراہیم یا سیفٹی ابراہیم" کے ناموں سے بڑی کرخت آواز میں پکارا کرتا تھا۔ آج یہ اچانک اس کے دل میں میرے لئے عزت و توقیر کا چشمہ کس طرح پھوٹ پڑا۔ میں ہمہ تن استعجاب ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے شاید بالکل پہلی بار مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"اوپر سے حکم آیا ہے کہ آپ کو اے کلاس میں بند کیا جائے۔ میں نے

دس کھولی وارڈ میں کھولی نمبر ، آپ کے لئے صاف کروانی شروع کر دی ہے ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آ کر آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ بڑی ملائم مسکراہٹ کے ساتھ واپس چلا گیا۔ یہ شاید طبقاتی تقسیم کے احساس ہی کا اثر تھا کہ سی کلاس ابراہیم کے لیے کلاس اے ابراہیم ہو جانے پر صوبیدار کی خشمگیں آنکھوں کی جھیلوں میں مسکراہٹوں کی جل پریاں تیر رہی تھیں۔ احمد علوی کے سوائے ببری، علی محمد، محمد مکرانی، شریف خان چندر رکمار اور سبھی مبارک باد دے رہے تھے۔ احمد علوی دفعتاً اداس ہو گیا تھا اس نے کچھ نہ کہا۔ جب میں کھولی میں اپنے ادھر ادھر بکھرے ہوئے کپڑے اکٹھے کر رہا تھا تو ببری اپنی خوف ناک شکل پر خوفناک مسکراہٹ سمیٹ میرے پاس آیا اور بڑے رازدارانہ لہجہ میں بولا۔

"بابو دس کھول سیل بڑے مجے کی جگہ ہے۔ کھسمت والے ہی کو ملتی ہے"

اس پر محمد مکرانی، شریف خان اور علی محمد قہقہہ مار کر ہنس پڑے میں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

شریف خان جو ایک شدبد پڑھا لکھا قیدی تھا اور جس نے چند سال قبل میرے پیارے دوست آغا شورش کاشمیری کے ساتھ منٹگمری جیل میں چار سال کاٹے تھے اور شورش کی صحبت کے فیضان نے اسے فصیح و بلیغ گفتگو کرنا بھی سکھا دی تھی۔ بڑے موڈ میں آ کر بولا۔

"اللہ دی کسم جلیس صاحب اگر مجھے کراچی جیل کی دس کھولی اور اللہ میاں کی جنت میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں دس کھولی سیل بہشت بریں پر ہر لحاظ سے ترجیح دوں گا۔"

میرا استعجاب اور بڑھا۔

افوہ! ایسی کون سی خصوصیت ہو سکتی ہے بھئی اس میں؟ یار کچھ اور بتاؤ اس کے بارے میں؟

شریف خاں نے عادتاً بھکڑپن کے ساتھ کہا۔

"باقی پردۂ سیمیں میں ملاحظہ فرمائیے۔"

میں نے اپنی بے نیازی دکھا کر اس پر نفسیاتی اثر ڈالنے کی کوشش کی یعنی اگر میں اپنی بے تابی کا اظہار کروں گا تو وہ دس کھولی اور زیادہ پُر اسرار اور بہت زیادہ الف لیلوی بنائے گا اور اگر میں بے نیازی کا اظہار کروں تو شاید وہ فوراً بتا دے گا۔ کیوں کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کوئی اہم بات بتانا چاہتا ہے اور دوسرا شخص اس سے بے پرواہی برتنا شروع کر دے تو پھر اس کی خلش اس وقت تک نہیں مٹتی جب تک وہ پوری بات اچھی طرح نہ اُگل دے اس لئے میں نے شریف خاں سے کہا۔

"اچھا نہیں بتاتے تو نہ سہی۔ میں تو اب وہیں جا رہا ہوں۔ میں خود ہی دیکھ لوں گا۔"

میرا یہ حربہ بڑا مؤثر اور کاری ثابت ہوا۔ شریف خاں سے نہ رہا گیا، اس نے اپنے استاد آغا شورش کاشمیری کا نام لے کر بات اُگلنی شروع کر دی۔

"میرے دوست دس کھولی سیل وہ جگہ ہے جس کے بارے میں چچا غالب نے کیا خوب شعر کہا۔

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

ادھر پریوں کا مجمع ہے ادھر لونڈی کی محفل ہے

"ہائے ہائے"

اس شعر کو شریف خاں کی زبان سے اتنا ذلیل ہوتا ہوا دیکھ کر مجھے بڑی گھن سی محسوس ہوئی لیکن احمد علوی نے یہ کہہ کر مزا بدل دیا کہ

معاملہ کچھ "سول اینڈ ملٹری" معلوم ہوتا ہے۔

میں نے خواہ مخواہ جھینپتے ہوئے کہا۔

مجھے سول اینڈ ملٹری معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

میں تو شادی شدہ آدمی ہوں۔"

ببری نے کہا۔

"ارے بابو، مجھے علی محمد، شریف اور محمد کو تو کیا رنڈوے سمجھتا ہے۔

ہماری تو ایک درجن بیویاں ہیں۔ مگر سالی جیل بڑی جالم جگہ ہے۔"

ابھی ہماری گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ صوبیدار معہ دو قیدیوں کے جن میں ایک کی ٹوپی پر کالے دھاگے سے وارچ مین لکھا ہوا تھا۔ میرے پاس آیا۔ وارچ مین نے میرے کپڑے اٹھا لئے۔ میں نے سب کے گلے لگ کر اجازت لی اور جس وقت میں احمد علوی سے گلے مل رہا تھا۔ تو اس وقت ہم دونوں کی آنکھوں میں اچانک آنسو امنڈ آئے جیسے ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔ مجھے ایک دو لمحے کے لئے تو یوں محسوس ہوا جیسے میں جیل ہی سے چھوٹ رہا ہوں۔

سی کلاس میرے لئے ایک چھوٹا سا جہنم ہی سہی لیکن ان پندرہ دنوں کے مختصر یا بے حد طویل عرصے میں چھوٹے درجے کے انسانوں کی بلند کامت محبت اور اعلیٰ درجہ کے خلوص نے میرا اس سے گہرا تعلق خاطر پیدا کر دیا تھا۔ اس کے چھوڑنے کے لئے بے قرار رہنے کے باوجود اسے چھوڑتے ہوئے مجھے بڑا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

میں صوبے دار کے ساتھ چل پڑا۔ "چکر" کے بڑے پھاٹک سے باہر نکلا تھا کہ میری نظر میرے نئے دوست غلام حیدر نانا اکبر آبادی پر پڑی جو شاید گورنر جنرل ہاؤس کے باغ کی صفائی کر کے واپس آ رہا تھا۔

میں نے غلام حیدر کو آواز دی۔

"بھئی غلام حیدر صاحب۔ افسوس کہ دو ہی دن میں ہماری آپ کی

دوستی ختم ہو گئی۔ میں اے کلاس میں جا رہا ہوں جانے اب ملاقات ہو یا نہ ہو بہر حال میں آپ کو بھول نہ سکوں گا۔"

غلام حیدر نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک مصرع پڑھا۔

"حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد۔"

مجھے غلام حیدر کو چھوڑتے ہوئے بڑا دکھ ہوا۔ جی چاہتا تھا کہ آخری بار اس سے دل کھول کر باتیں کروں۔ لیکن صوبیدار نے غلام حیدر کو ڈانٹ پلائی۔

اوئے غلام حیدر ــــــ سالے مشتری کے بھڑوے۔

چل اندر ــــــ بڑا آیا فارسی لغات چھانٹنے والا۔

غلام حیدر گالی کھا کر اداس سر نیوڑھائے دوسرے قیدیوں کے ساتھ چکر کے اندرونی پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ "مشتری کے بھڑوے" کے خطاب نے دراصل مجھے بھی بڑی تکلیف پہنچائی تھی۔ لیکن جیل میں شرافت کی جگہ ــــــ!

میں صوبے دار کے ساتھ چل پڑا جب ہم داہنے ہاتھ کی سمت مڑے تو سامنے لوہے کے جنگلے کے پیچھے کھولیوں کی ایک قطار نظر آئی۔ جس کے پھاٹک پر "تارکول سے لکھا ہوا تھا ــــــ اور جب میں نے دس کھولی کو دونوں طرف اسے غور سے دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ شریف خاں نے دس

کھولی کے بارے میں یہ کیوں کہا تھا کہ "اُدھر پریوں کا مجمع ہے۔ اِدھر لونڈوں کی محفل ہے"۔ شریف خاں نے ایک اچھے شعر کو رذیل بنانے کے باوجود پوری واقفیت سے کام لیا تھا۔ کیونکہ سچ مچ اس کھولی کے ایک طرف قیدی عورتوں کی بارک تھی۔ اور دوسری طرف "چھوکرا پارٹی" جس میں پندرہ سال سے کم عمر مجرم لڑکے بند کئے جاتے تھے۔

عورتوں کا بارک بالکل پُرانے بادشاہوں کی کسی حرم سرا سے ملتا جلتا تھا۔ اونچی اونچی سی چاردیواری اور ایک بڑا سا بند دروازہ جس پر باہر سے قفل لگا دیا گیا تھا۔ مجھے یہ عورتوں کا سیل ہندوستان اور پاکستان کے گھروں کا ایک ماڈل ہاؤس معلوم ہو رہا تھا۔ گویا اسی ماڈل ہاؤس کو دیکھ کر ہندوستان اور پاکستان کے باشندوں نے اچھے گھر تعمیر کئے ہیں اور ان میں اپنی اپنی عورتیں کو قید کر رکھا ہے۔ میں نے صوبیدار سے پوچھا۔

"اس میں کتنی عورتیں قید ہیں ——؟"

صوبیدار نے جواب دیا۔

گیارہ۔ جن میں سے ایک پگلی ہے جو سارا دن بھر اوٹ پٹانگ فلمی گانے گاتی ہے۔ اب آپ تو اس کے ہمسائے ہیں آپ بھی ہمارے جیل کا "گراموفون" خوب سنیں گے۔

مجھے اپنے وطن حیدرآباد دکن کے ایک شہزادے کی حرم سرا یاد آ گئی۔

اس میں بھی ایک عیاش شہزادے کی خاطر گیارہ عورتوں کو قید کیا گیا تھا۔ اور جس میں سے ایک عورت کسی طرح بھاگ نکلی تھی اور میرے ایک دوست کے گھر میں چھپی ہوئی تھی۔ اس عورت نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ضلع بیدر کے ایک شریف خاندان کے افسر کی بہو بیٹی تھی۔ ایک بار جب شہزادے کی سواری بیدر کی سڑکوں پر سے گزر رہی تھی اور اس عورت نے اپنے آقا اپنے شہزادے کو دیکھنے کے اشتیاق میں کھڑکی سے جھانکا تو معاً شہزادے کی شہوت بھری نگاہیں اس پر پڑیں اور وہ شہزادہ اس کی غزالی آنکھوں پر ایسا فریفتہ ہوا کہ فوراً اپنی سواری رکوالی۔ اور پھر چوتھے پانچویں دن وہ عورت ماں باپ اور شوہر کے قید خانوں سے نکال کر شاہی حرم کے قید خانے میں منتقل کر دی گئی۔ اس غریب عورت نے صرف ایک بار شہزادے سے ہم آغوش ہونے کا "شرف" حاصل کیا۔ اور پھر فرار ہونے سے پہلے پانچ سال تک تنہائی جوانی کی آگ میں جلتی اور بھٹکتی رہی۔

جیل کی حرم سرا پر بھی ویسی ہی اداسی اور ویسا ہی سناٹا طاری تھا جیسا کہ دکھن کی دیسی ریاست کے عیاش شہزادے کی حرم سرا پر چھایا ہوا تھا۔

(۱۳)

جیسے ہی میں دس کھولی کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اندر رہنے والے
آٹھوں اے کلاس قیدیوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان میں سے میں صرف پردھان
سیٹھ سے واقف تھا۔ جو جیل کے سارے قیدیوں کے کھانے کے انچارج تھے
پردھان سیٹھ روزانہ ہمارے بارک میں تین باورچی قیدیوں کے ہمراہ آتے
اور ہمارا بھتہ یعنی کھانا تقسیم کروایا کرتے تھے۔ ان سے میری واقفیت
دوستی میں اس طرح تبدیل ہو گئی تھی۔ کہ وہ روزانہ اخبار ملت (گجراتی) پڑھا
کرتے تھے اور میرے اور شہر کے عام سیاسی حالات کے بارے ایسی خبریں سنایا
کرتے تھے جو اردو یا انگریزی ڈان میں نہیں شائع ہوتی تھیں۔
—— جیل میں پردھان سیٹھ ہمارے لئے کسی اخبار کے اسٹاف

رپورٹر تھے۔
اب جو پردھان سیٹھ کا تفصیلی تعارف ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ بےچارے
پردھان جی کراچی کے بہت بڑے تاجر تھے۔ لکھ پتی اور کروڑ پتی تاجروں میں
ان کا شمار ہوتا تھا۔ گھی کی تجارت کرتے تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے جب کراچی
میں گھی کے سارے تاجر ہندو تھے۔ اس وقت پردھان جی واحد تاجر ایسے
تھے۔ جنہیں پورے سندھ کے لئے گھی کی ہول سیل ایجنسی حاصل تھی۔ اور
اسی وجہ سے انہیں "کنگ آف گھی" یعنی گھی کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔
پردھان جی نے مجھے بتایا کہ تقسیم ملک سے پہلے فرقہ وارانہ اختلاف
نے جہاں سارے ملک کی فضا میں زہر گھول دیا تھا۔ اور بدیشی سامراج نے
یعنی انگلینڈ کے دلال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی
.... خلیج کھودنی شروع کی تھی۔ اس وقت گھی کے سارے
ہندو تاجران کے دشمن ہو گئے تھے کہ وہ کسی مسلمان تاجر کو گھی کا بادشاہ
بنا ہوا نہیں دیکھ سکتے —— اسی دوران میں سیٹھ پردھان نے اپنی اس
"مسلمانی" کو چھپانے کی بڑی کوشش کی۔ سیٹھ غلام حسین پردھان سے "جی۔
ایچ پردھان" بھی ہو گئے لیکن بدیشی سامراج نے ارض ہمالہ کے ہر غلام حسین
اور ہر رام لال کا چہرہ ایک دوسرے کے آگے اس طرح بے نقاب کر دیا تھا
کہ کوئی غلام حسین پردھان جی ایچ پردھان ہونے کے باوجود بھی نہیں چھپ

سکتا تھا۔

اس پس منظر کی روشنی میں پردھان سیٹھ نے مجھے بتایا کہ ان کے تمول اور ان کی عزت سے ہندو تاجروں کو ایسا غم و غصہ تھا کہ انہوں نے سیٹھ غلام حسین پردھان کو نہ صرف تجارت کے راستے سے ہٹانے کے لئے بلکہ ایک مسلمان کو اپنے کندھوں سے گرانے کے لئے انہوں نے ایک "پھڈا" بنایا۔ (بقول غلام حسین سیٹھ یا بقول سندھی بولنے والے باشندوں کے کسی فرضی یا جھوٹے واقعے کا ایک لوکل نام پھڈا ہے)۔ پھڈا یہ بنایا گیا تھا کہ سیٹھ پردھان نے ایک نابالغ ہندو لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کیا ہے۔

ان دنوں کراچی کے ارباب اقتدار گورنر سے لے کر ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر ...... بھی ہندو یا انگریز تھے۔ اس لئے گھی کا بادشاہ گھی کے پیپے پرے معزول کر کے سنٹرل جیل کراچی میں محبوس کر دیا گیا تھا لیکن گھی کا اتنا بڑا تاجر ہونے کے باوجود پریوی کونسل تک بھی گیا تھا لیکن گھی کا اتنا بڑا تاجر ہونے کے باوجود پریوی کونسل کو روغن کا نہ مل سکا اور پچھلے پانچ سال سے کراچی سنٹرل جیل میں بنا سپتی گھی کے کھانے کھا کھا کر دبلا ہوتا جا رہا تھا ______ ممکن ہے کہ پردھان سیٹھ سچ ہی کہتا ہو یا پھر ممکن ہے کہ پردھان سیٹھ ایسی کسی زنا بالجبر قسم کی حرکت کا مرتکب ہوا ہو۔ کیونکہ وہ بہت بڑا تاجر تھا اور وہ بھی گھی کا تاجر جس کی پانچوں انگلیاں ہر دم گھی میں

اور سر کڑاھی میں رہتا ہے ______ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں پردھان سیٹھ کا کوئی قصور نہ ہو کیونکہ جب پیسہ اور گھی اکٹھے ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی عورت کی عصمت ضرور خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

پردھان سیٹھ نے دس کھولی سیل کے پھاٹک پر مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر میرا استقبال کیا اور دوسرے ساتھیوں سے میرا تعارف کرنا شروع کیا۔

ان سے ملئے ______

یہ چوہدری اسماعیل اللہ دتہ ہیں۔

یہ مزدور رکن ابراہیم مالاباری ہیں۔

یہ مسٹر رمضان ہیں۔

یہ ہمارے عیسائی دوست مسٹر لینو ٹیلس ہیں۔

یہ خان عبدالقادر خاں ہیں۔

یہ مسٹر عزیز حسین عابدی ہیں۔

اور یہ اپنے بہت بڑے سیٹھ مسٹر رحمت اللہ ہیں۔

اسی اثنا میں چائے آ گئی۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر اپنے نئے ساتھیوں کے ساتھ چائے پی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو لے کلاس میں آنے سے پہلے ایک فائدہ یہ تو ہوا کہ چائے ملتی رہے گی ______ چائے جس پر اگر میں

جان نہیں دیتا تو کم از کم اس پر جان دینے کی خواہش ضرور رکھتا ہوں چائے
جو مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر کراچی ریلوے اسٹیشن کے ایک قلی تک ہر شخص
کی "واحد محبوب پینے کی چیز ہے"۔
جو بقول مشتہرین پلٹن ٹی گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی
پہنچاتی ہے۔ یا پھر جو چند اور پاکستان کے کروڑوں انسانوں کی بھوک مارنے
کی مجرب دوا ہے۔

چائے پینے کے بعد میں اپنے نئے دوستوں کے ساتھ ایک سیمنٹ کے
حوض پر بیٹھ گیا۔ اور ہم الف لیلیٰ کے درویشوں کی طرح اپنی اپنی داستانیں
ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

ابراہیم مالاباری پینتیس چالیس سالہ ایک سیاہ فام آدمی ہیں۔ جو پہلی
ہی نظر میں صدفی صد مزدور نظر آتے ہیں۔ نہایت دُبلے پتلے۔ خمیدہ پشت
مزدوری کی وزنی زندگی اور جیلوں کی مشقتوں نے ان دونوں کی ٹانگوں میں
خم پیدا کر دیئے ہیں انہوں نے بتایا کہ وہ جیل محض اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ
وہ مزدوروں میں کمیونسٹ پارٹی کے اخبار بیچا کرتے تھے۔

رمضان اور لینو ٹیلس متوسط در کے گٹھیلے اشخاص علی الترتیب
ایک فرم ایک دوکان میں ملازم تھے اور حسابات کے غلط اندراج اور روپے
کے غبن کے شبہ میں دھر لئے گئے تھے۔

عبدالقادر پشاور کے رہنے والے اور کراچی کے بڑے ممتاز تاجر ہیں ان
کی آدھی زندگی یورپ اور امریکہ میں گزری ہے۔ انہوں نے کشمیر کے بارے
میں ایک بڑی مستند کتاب .... بھی لکھی ہے۔ ان کی گرفتاری کی
وجہ اس لئے معلوم نہ ہو سکی تھی کہ پبلک سیفٹی ایکٹ اندھا ہونے کے علاوہ
گونگا بھی ہوتا ہے۔

عزیز حسین عابدی ایک بھاری بھرکم خوش شکل عینک پوش تعلیم
یافتہ کٹر مسلم لیگی لیکن بے حد آزاد خیال اور خدا وندا کے بڑے ہی سادہ دل
بندے تھے جو درویشی اور سلطانی دونوں کو عیاری سمجھتے تھے۔ دورانِ تعارف
ہی میں میں ان سے اپنے آپ کو بڑا قریب محسوس کرنے لگا۔ بے چارے
عابدی صاحب کسی دفتر میں صرف دو سو روپیہ رشوت لینے کے جرم میں ایک
سال قید سادہ کی سزا ایک پُر تکلف بستر اور ایک تھرموس لے کر اندر آئے
تھے۔

سیٹھ رحمت اللہ کراچی کے بہت بڑے "تاجر پارچہ تھے جو بیرون ملک
سے ہزاروں روپے کی امپورٹ ایکسپورٹ کرتے تھے۔ ان کے بارے میں
معلوم ہوا کہ افغانستان کے کپڑے کی ناجائز درآمد یا برآمد کے سلسلے میں
ان کو کسی افسر کو پندرہ ہزار روپیہ رشوت دیتے وقت ریڈیو پاکستان
کے ریکارڈوں اور کراچی کے مجسٹریٹوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ یہ ریڈیو

پاکستان اور حکومتِ پاکستان کا شاید پہلا کارنامہ تھا کہ انہوں نے رشوت
لینے والے کے بجائے رشوت دینے والے کو پکڑا تھا۔

سیٹھ رحمت اللہ بڑے مرنجان مرنج آدمی تھے۔ دُبلے پتلے، کالا رنگ
ایک کندھا جھکا ہوا۔ ہاتھوں میں بے انتہا دولت کی لکیریں اور خارش کی پھنسیاں
تھیں۔ بغیر کالر کی قمیص پہنے تھے۔ لیکن گلے کا بٹن ہمیشہ بالالتزام بند ہوا
کرتا تھا۔ سر پر بالوں کی ایک گول ٹوپی ہمیشہ اوڑھا کرتے تھے۔ میرے لے
کلاس آنے سے شاید ایک دن پہلے جیل میں آئے تھے۔ اس لئے بڑے گھبرائے
پریشان، اوڑھے اوڑھے سے بیٹھے تھے۔ مجھے ان میں صرف ایک بات پسند
آئی اور وہ تھا ان کا تکیۂ کلام ——— کیا ——— اپنی داستان سناتے
ہوئے انہوں نے مجھے بتایا۔

ابھی کل ہی جیل میں آیا ہوں کیا۔ میرا وکیل بڑا ہی بے کیا۔ دو
تین دن میں میری بیل ہو جائیں گی کیا۔ فر میں چھوٹ جاؤں گا میں ———
جیل میں آنے سے میری ناک کٹ گئی ہے۔

میں نے شرارتاً ان کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"ابھی سیٹھ صاحب آپ ادھر میں پریشان نہ ہوں کیا۔
آپ جلدی چھوٹ جائیں گے کیا۔ قانون دولت مندوں
سے ڈرتا ہے کیا۔ آپ اس جیل میں ایک دو روز کے

مہمان ہیں کیا ——— !"

سب کے سب میرے مذاق پر ہنس پڑے لیکن صاحب میری
گفتگو سے متاثر ہو چکے تھے اور میرے آخری جملے کو دہراتے ہوئے بولے۔

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے کیا ——— !"

سب سے آخر میں میرا تعارف چوہدری اسماعیل صاحب
سے کرایا گیا چوہدری صاحب چالیس پینتالیس سال کے بڑے
سنجیدہ قسم کے پنجابی بزرگ تھے۔ متوسط قد۔ دبلا مگر گٹھیلا
جسم۔ سر کے بال خشخشی اور سفید ——— ان پر جو فردِ جرم
عائد کیا گیا تھا اس کو سُن کر میں صرف دو رائے قائم کر
سکتا ہوں ایک تو یہ کہ یہ قطعاً جھوٹ ہے اور دوسری یہ
کہ قیامت واقعی ہے۔ بھلا یہ کون یقین کر سکے گا کہ چوہدری
صاحب جیسا جہاندیدہ۔ معزز۔ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار
انسان اپنی نوجوان بیٹی کے ساتھ ایک رات برہنہ اور رنگے
ہاتھوں پکڑا ہے اگر یہ واقعہ بالفرض محال سچ بھی ہو تب
بھی میں اس کو جھوٹ ہی سمجھوں گا اور سمجھتا ہی رہوں گا۔
کیونکہ میں کسی طرح بھی سچ کی توہین گوارا نہیں کر سکتا۔ سچ
ایسا بھیانک کبھی نہیں ہوتا؟؟؟

بہر حال پچھلے ایک سال سے چوہدری صاحب قانون کی نظر میں ایک زیرِ دریافت مجرم تھے ۔ اور ہر چودھویں تاریخ بعد عدالت جاکر آئندہ پیشی کی تاریخ لے آنا ایک سال سے چوہدری صاحب کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا ۔

ویسے جیل میں چوہدری اسماعیل ۔ رمضان اور لینو ٹیلس کے علاوہ زیرِ دریافت ملزمین کی تعداد ساٹھ فیصدی سے بھی زائد تھی اور چالیس فیصد ملزمان ایسے بھی تھے جو ہر پیشی پر عدالت جاتے لیکن جج کی صورت تک دیکھے بغیر آئندہ پیشی کی تاریخ لے کر ایک ایک سال اور دو دو سال سے جیل اور عدالت کے درمیان انصاف اور سزا کے بیچوں بیچ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں جھنجھناتے پھر رہے تھے ۔

دس کھولی کی سیل کی الف لیلیٰ کا آخری درویش یعنی میں اپنی داستان سنا ہی رہا تھا کہ حوالدار چوہدری نذیر حسین چابیاں جھنجھناتا اور ہکلا ہکلا کر پکارتا ہوا آیا ۔

"چ چ چ چلو ـــــ س س ساب لوگ اپنی اپنی کھو کھولیاں پکڑ ڈ۔"

میں نے حیرت سے پوچھا ۔

"کیوں پردھان جی ـــــ اے کلاس قیدی کو بھی رات میں بند کر دیا جاتا ہے ـــــ ؟"

پردھان جی نے ہنس کر اٹھتے ہوئے کہا ۔

"اور کیا ـــــ یہ کراچی جیل ہے کراچی جیل ۔"

ہم لوگ اپنی اپنی کھولیوں میں داخل ہو گئے ۔ لالٹین جلائی ۔ اور لالٹین کے مدھم اجالے کے ساتھ اداسی اور دکھ کمرے کی فضا میں پھیلنے لگا ۔ اور مجھے کان کے قریب بھن بھن کرنے لگا کہ یہ کراچی جیل ہے کراچی جیل !

بڑی دیر تک میں دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا اندھیرے کے لشکروں کی شورش کو دیکھتا رہا ۔ جو ستاروں کی شمعیں جلا جلا کر چاروں طرف سے کراچی جیل پر چڑھتے آرہے تھے ۔

(۱۵)

جیل کی آہنی اور سنگین زندگی میں پورے پندرہ دن بعد مجھے دس کھولی سیل میں ایک گھریلو قسم کا ماحول میسّر آیا۔ میری کھولی جس کا نمبر ۲ تھا ایک نواڑ کے پلنگ، ایک چھوٹی میز، ایک کرسی، ایک اسٹول، ایک کپ بورڈ ایک شلیف اور ایک کوڑے سے آراستہ تھی۔ پلنگ کے نیچے ٹیٹنگ کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا اور میں اس گدیلے پر اوندھا لیٹا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس اندھیرے کو دیکھ رہا تھا جو بڑے ہی ڈراؤنے انداز میں بھرے ہوئے پٹ سن کے تیز نوکیلے ریشے میرے جسم میں فاطمہ، شہریار، زویا، بی بی، افتخار اور زبیدہ کی یادوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ اب شاید فاطمہ کا بستر بھی کانٹوں کا بستر بن گیا ہو گا۔ ہم دونوں ظلم و تشدد کے اندھیرے کی مضبوط دیوار کے دونوں طرف یاد

کے برمے سے اس دیوار میں ایک ننھا سا سوراخ بنا کر ایک دوسرے کو دیکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔

ابھی شاید دس بھی نہ بجے ہوں گے کہ اچانک عورتوں کے سیل سے بچگی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اور پھر اس نے ایک ایسا ہیبت ناک قہقہہ لگایا کہ میں سہم گیا اور دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے دیوار پہ دیکھا کہ میری طرح ہر کھولی کے قیدی دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے تھے اور ہر قیدی کا سایہ کھولی سے آزاد ہو کر سامنے والی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً نو کے نو قیدی عورت کے قہقہے کی کشش سے اپنے بستروں سے اٹھ کر دروازے تک پہنچ گئے تھے چونکہ دروازہ بند تھا۔ اس لئے ان کے سائے ان کے خواب اور ان کے خیالات عورت کے قہقہے کے مقناطیس کی طرف کھینچ رہے تھے۔

کھولی نمبر ۲ والے قیدی نے نسوانی قہقہے کی حد سے تڑپ کر ایک سیٹی بجائی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس سیٹی میں دو سال سے دبی ہوئی اور گھٹی ہوئی جنسی خواہش سموئی ہوئی ہے۔ سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی بچگی کے تڑپ تڑپ کر بے تحاشا قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔ گویا سیٹی کی لہریں کسی گرم ہاتھ کی انگلیاں ہوں جو اس کے پیاسے جسم کو گدگدا رہی ہوں۔ سیٹی اور قہقہے بڑی دیر تک ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہے ایک دوسرے سے

الجھے رہے۔ پگلی پر جیسے ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے اور قہقہوں کے بجائے وہ بھیانک طور پر چیخنے لگی اور چیختے چیختے اچانک خاموش ہوگئی۔ اس کی دم توڑتی ہوئی چیخوں کے گرد خاموشیوں کے غول جمع ہو چکے تھے۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب وہ آسودہ ہو چکی ہے اور ایک آسودہ عورت کی طرح گہری نیند سو رہی ہے۔ میں بستر پر آکر دھڑام سے گر پڑا اور آنسوؤں کے شرارے بکھیر کر اپنے پیاروں کو دیکھنے لگا۔ جو لوہے کی سلاخوں۔ پتھر کی دیوار اور اندھیرے کی فصیل کے اس طرف سسک سسک کر اور بلک بلک کر رو رہے تھے۔

رات کبھی آنکھوں کے آتشکدوں میں جلتی رہی اور کبھی ڈراؤنے خوابوں میں ہوش و حواس کھوتی رہی۔ وہی نیند ــــــ نیند کی پری اسے تو سنٹی ایکٹ کا دیو کبھی کا اڑا لے گیا تھا۔

صبح سویرے غنودگی کا سا عالم طاری تھا کہ اچانک زور سے آہنی قفل کے کھلنے کی آواز آئی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ سحر!! لیکن انتظار تھا جس کا وہ یہ سحر تو نہ تھی۔

آنکھوں کے آتشکدے ابھی تک دہک رہے تھے۔ اس لئے میں نے نے نلکوں پر جا کر تین بالٹی پانی اپنے پھنکتے ہوئے جسم پر بہا دیا۔ کچھ کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا اور تھوڑی ہی دیر بعد چائے بھی آگئی۔ ایک پاؤ ڈبل روٹی

اور ایک مکھن کی ٹکیا نگل کر کڑوی کسیلی چائے پی لی۔ ابھی سگریٹ کشی کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ سامنے سے دو قیدی جیل کے پھاٹک کی طرف لئے جاتے نظر آئے ان کے ساتھ صوبے دار دو سپاہی اور تین چار واچ مین تھے۔

میں نے اپنے "واچ مین" منظور سے پوچھا کہ

"کیا معاملہ ہے یہ ــــــ؟"

واچ مین منظور نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔

"صاحب ان دونوں کی "سپین ڈنٹ" کے پاس پیشی ہے۔ بڑے حرامی ہیں سالے۔ توبہ توبہ رات بڑی گڑبڑ کر دی انہوں نے۔"

بی کلاس قیدی "رمضان" نے ان دونوں میں سے ایک قیدی کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"سالا رحمت اب بھی باز نہیں آتا۔ سالے کو ایسے برے کاموں میں تین بار پھڑ کے لگ چکے ہیں۔"

رمضان نے واچ مین سے پوچھا۔

"دوسرا کون ہے ــــــ؟"

واچ مین نے جواب دیا۔

"بابو جی" نوا چھوکرا ہے۔ میں بھی نہیں جانتا۔ دو دو جوتے ہوئے سجا لگی ہے رحمت خاں سالا بس اسی دن سے اس کی کوشش کر رہا تھا۔ کل شام اس نے اس کو

کو پانچ بیڑیاں دیں اور معاملہ پٹایا۔

میں نے رمضان سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ ______ تھو تھو ......"

رمضان نے کہا۔

"جلیس صاحب۔ ادھر تو روز "لاحول ولا" ہوتا رہتا ہے سپاہی تک "لاحول ولا" کرتے ہیں۔ لیکن یہ رحمت خاں" کی سارے سپاہیوں سے لڑائی ہے۔ اس لئے سپاہی اس کی تاک میں رہتے ہیں۔ اور پکڑ لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"اچھا پیشی میں کیا ہوگا ______؟"

رمضان نے کہا۔

"اب آپ ہی دیکھ لیجیے۔ آپ کے سامنے دونوں کو پچیس پچیس پھڑکے لگائے جائیں گے۔ پھڑکے سمجھتے ہیں نا آپ

______ فلاگنگ

______ فلاگنگ"

کوئی گیارہ بجے کے قریب سپرنٹنڈنٹ، جارون جیلیر۔ ڈاکٹر، صوبیدار اور سپاہی پھاٹک کے اندر آئے اور کرسیوں پر نیم دراز کی شکل میں بیٹھ گئے

سب سے پہلے اس لڑکے کو ٹکٹکی پر باندھا گیا جس کے ساتھ بُرا فعل کیا گیا تھا اور ایک پرانے قیدی نے سڑے ہوئے پیشاب میں بھگوئی ہوئی بید کی چھڑی اس کے ننگے چوتڑوں پر برسانی شروع کی کیونکہ اس کا پاجامہ اتار دیا گیا تھا۔ پہلی ہی بید پر وہ لڑکا ایسی ہیبتناک آواز میں چیخ پڑا کہ میرے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

بید کی ہر مار پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی روح کسی تیز چیخ کے ہمراہ اس کے قالب سے نکل جائے گی۔ لیکن سب چپ چاپ یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور ہر بار صوبیدار چیخ پڑتا تھا ______ ایک ______ دو ______ تین ______ چار ______ پندرہ ______ اٹھارہ۔

اٹھارویں بید پر لڑکا ادھ موا ہو کر ٹکٹکی پر لٹکنے لگا۔ سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ کے اشارے سے بید لگانے والے قیدی کو روک دیا۔ لڑکے کو ٹکٹکی سے الگ کیا گیا مگر وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ جہاں بید کی مار پڑی تھی وہاں سے کھال پھٹ گئی تھی اور اندر سے گوشت کے لوتھڑے باہر نکل آئے تھے۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں دنیا کے ابتدائی دور میں ہوں اور میرے اطراف اولین وحشی قبائلیوں کا ہجوم ہے اور ایک انسان وحشی قوانین کے شکنجے میں بُری طرح تلملا رہا ہے۔

اس کے بعد رحمت خاں کو ٹکٹکی پر باندھا گیا اس کا پاجامہ بھی اتارا گیا اور صوبے دار کی آواز ——— ایک ——— کے ساتھ ہی بید اس کے ننگے چوتڑوں پر پڑی ۔ رحمت خاں چیخنے چلانے کے بجائے بید کی ہر مار پر صرف "یا علی" پکارا کرتا تھا ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس پر اس مار کا کوئی اثر نہیں ہے ۔جب اسے اکیسواں پھڑ کا لگ چکا تو میں نے رمضان سے کہا ۔

"یار رمضان !

یہ تو بڑا بہادر آدمی ہے ۔"

رمضان نے جواب دیا ۔

"بہادر وہادر کچھ نہیں سالے نے خوب "چرس" پی رکھی ہے ۔جب نشہ اترے گا تو سالے کو پتہ چلے گا ۔ آٹھ پندرہ دن تک آدمی نہ تو بیٹھ سکتا ہے ۔ اور نہ چت لیٹ سکتا ہے مسٹر ۔"

رحمت خاں کو پورے پچیس پھڑکے لگائے گئے جب اسے ٹکٹکی سے علیحدہ کیا گیا تو صرف ذرا سا پیر پھیلا کر اور خفیف سا لنگڑا کر چلنے لگا اس نے اپنا پاجامہ خود پہنا اور پھر اپنے وارڈ مین کے ساتھ آئیوڈین لگوانے ہسپتال جانے لگا ۔

بعد میں صوبے دار سے ہمیں پتہ چلا کہ جب رحمت خاں کو پورے ۲۵ پھڑکے لگائے گئے تو سپرنٹنڈنٹ نے رحمت سے پوچھا تھا ۔

" ویل کیا تم پھر ایسا کام کرے گا ۔"

تو رحمت خاں نے بڑی ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔

"پاشا ہو ۔تسی حکم کرو تو اک دو دن وچ فیر حاضر خدمت ہو جاؤں گا ۔"

یہ جملے سن کر میں دنگ رہ گیا ۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ انسان اپنے پیٹ کی بھوک تو روک سکتا ہے لیکن وہ سخت سے سخت اذیت ناک سزا کے باوجود اس بھوک کو دبا نہیں سکتا ——— !

پھر معاً مجھے بیری کا وہ جملہ یاد آ گیا جو جیل میں پہلے دن مجھے روتا ہوا دیکھ کر بیری نے کہا تھا ۔

"ہش بابو ..... روتا ہے ہونہہ ؟ ارے بابا یہ تو جیل نہیں چکلہ ہے چکلہ ...."

(۱۶)

پھڑکے بازی کی اذیت ناک سزا کا منظر جب میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں قدیم یونان کے کسی ایمفی تھیٹر سے واپس آیا ہوں یا پھر میں نے دنیا کے اولین قبائل دور کی تاریخ کا کوئی نہایت ہی بوسیدہ صفحہ پڑھا ہے۔

جس جگہ رحمت خاں اور اس کے مفعول کو پھڑکے لگائے گئے تھے اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن رمضان ابھی تک اس جگہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے مذاق سوجھا اور میں نے رمضان سے کہا۔

"یار رمضان۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں بھی "ملٹری گوٹ" سے بڑی دلچسپی ہے۔"

رمضان نے جواب دیا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ میں تو دراصل اس وقت اپنی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔

"محبوبہ ـــــ کیا یہاں بھی کوئی محبوبہ آتی ہے۔ یہ تو صرف مردوں کا جزیرہ ہے۔ یہاں عورت یا محبوبہ کی لطافتیں کہاں؟"

رمضان نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"ہاں یہاں بھی ایک محبوبہ ہے۔ جس پر میرے علاوہ اس جزیرے کے تیرہ سو باشندے بیک وقت عاشق ہیں اور ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ـــــ وہ جیل کی قلوپطرہ ہے۔"

میری دلچسپی اور بڑھی۔ میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"جیل کی قلوپطرہ ـــــ یار کہاں ہے وہ! کیا اسے دکھانے میں تم بخل سے تو کام نہیں لوگے ـــــ؟ اور اگر تم کوئی ہرج نہ محسوس کرو تو میں تمہارے رقیبوں کی تعداد ۱۳۰۰ کر دوں؟"

رمضان مسکرانے لگا اور بولا۔

"گھبراؤ نہیں۔ وہ ابھی ابھی آتی ہوگی۔ اب ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں نا ـــــ؟ بس اب آتی ہی ہوگی۔ میں اسی کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔"

میں بھی وہیں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور تصور کی نظروں سے میری ان دیکھی قلوپطرہ کے چہرہ مہرہ اور جسم کے خطوط بنانے لگا!

تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ جیل کے بڑے پھاٹک کا سیاہ بغلی دروازہ کُھلا اور رمضان چیخ اٹھا۔

"ہَک ——— مسٹر جلیس ہَک ایٹ لا بیلا ڈیم سا مری آف کراچی جیل۔"

میں نے دیکھا کہ ایک چھ فٹ لمبی چوڑی۔ آسمانی رنگ کی ساڑھی اور زرد رنگ کے بلاوز میں ایک سیاہ رو عورت سیاہ رنگ کی گرگابی کی اونچی اونچی ایڑیوں پر تھرکتی ہوئی جیل کے اندر داخل ہوئی۔

ہائے قلوپطرہ ——— !

قلوپطرہ عورتوں کے بارک کی جیلر تھی۔

قلوپطرہ جب اور زیادہ قریب آ گئی اور اس کے خدوخال بہت واضح نظر آنے لگے تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر اپنی کھولی میں چلا جاؤں اور چھپ جاؤں ورنہ کہیں وہ مجھے ہڑپ نہ کر لے ——— ! توبہ توبہ یہ کتنی بڑی بڑی سرخ اور ڈراؤنی آنکھیں تھیں اس کی۔

جب وہ عورتوں کے بارک کے دروازے پر پہنچ گئی تو رمضان کی طرف مسکراہٹ کا ایک ٹکڑا پھینکا اور پوچھا۔

"پلیز سینڈ تو ڈیز۔ ڈان" مسٹر رمضان"۔

رمضان ایک باوفا اور بھولے عاشق کی طرح گھگھیا کر بولا۔

"آل رائٹ سینڈنگ جسٹ ناؤ میڈم"

اور پھر وہ اردو میں بولا۔

"ڈان تو کیا تیرے لئے جان بھی دے سکتا ہوں پیاری"۔

اس وقت رمضان بالکل "ڈان جان" معلوم ہو رہا تھا۔ رمضان دوڑا ہوا اندر اپنی کھولی میں گیا اور ڈان اخبار واچ مین منظور کو دیا کہ فوراً دے آئے اور پھر پھاٹک پر کھڑا ہو کر منظور کے ڈان دینے، قلوپطرہ کے ڈان لینے اور اپنے جان دینے کے منظر کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔

قلوپطرہ نے رمضان کی طرف پھر مسکرا کر دیکھا اور بولی۔

"تم بھی پانچ منٹ میں اسے واپس کر دے گا"۔

رمضان نے جیسے گھبرا کر جواب دیا۔

"نہیں نہیں ——— واپس ہرگز نہ کرنا میڈم"۔

قلوپطرہ مسکراتے ہوئے اندر بارک میں چلی گئی۔ میں نے رمضان کو بنانے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار تم نے اس قدر گھبرا کر کیوں جواب دیا کہ واپس ہرگز نہ کرنا۔ وہ تو اخبار تھا تمہارا دل تو نہیں تھا ——— کہ تم گھبرا گئے ——— !"

رمضان نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف "ہائے" کہتا ہوا اپنی کھولی میں چلا گیا اور دھڑام سے اپنے بستر پر گر پڑا۔ مجھے بے چارے کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہی جیل کی قلوپطرہ اگر کبھی رمضان کو یا کسی بھی مرد کو ملتی اور اس کو مسکراتے ہوئے دیکھتی تو شاید رمضان اور شائد جیل کا ہر فرد اس سے کوسوں دور بھاگ جاتا لیکن اب یہاں جیل میں آ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ عورت کا حسن محض مرد کی تشنگی ہے۔ جو مرد جنسی طور پر جتنا زیادہ بھوکا اور پیاسا ہو گا اسے بدصورت سے بدصورت عورت بھی پری جمال اور ماہ رو نظر آنے لگی۔ اسی طرح جو مرد جنسی تعلقات میں جتنا زیادہ آسودہ ہو گا اس کے لئے خوبصورت سے خوبصورت عورت میں کوئی زاویہ حسین نظر نہیں آئے گا۔

آج مجھے جیل کی قلوپطرہ شکسپیئر کے ڈراموں کی جادوگرنی اور ڈائین نظر آ رہی ہے کیونکہ ابھی میں نو گرفتار ہوں۔ جنسی آسودگی بھی ابھی تک باقی ہے لیکن شاید جب وقت کچھ اور گزر جائے تو شائد یہی کوہستان۔ بدصورتی "مجھے" "گلستان حسن" معلوم ہونے لگے۔

بالکل ایسے ہی جیسے برسوں سے دلکشی کھوئی ہوئی بیوی طویل عرصہ میکے میں رہ کر آنے کے بعد اچانک نئی اور خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے۔

عورت کا حسن اگر فروغی نہیں تو کم از کم ایک مسرت کا نام ہے ایک

فاصلے کا نام ہے۔ ایک بھوک کا نام ہے۔ ایک پیاس کا نام ہے اور یہ سب کچھ بھی نہیں تو عورت کا حسن صرف مرد کی نگاہ ہے۔

قلوپطرہ عورتوں کے بارک میں اوجھل ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مجھے جیل کے سخت اور پتھریلے ماحول میں اچانک گداز اور نرمی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید قلوپطرہ کے وجود کا اثر تھا۔

میں نے اس گوارا ماحول کو اور زیادہ خوشگوار بنانے کے لئے سگریٹ جلایا جیسے میں نے سگریٹ جلایا تو چھوکرا پارٹی کے تین چار نوعمر لڑکے آ گئے۔ ان میں وہ لونڈا رفیق بھی تھا۔ جو حوالات میں میرے ساتھ تھا۔ رفیق نے اپنے ساتھیوں پر رعب ڈالنے کے لئے کہ میں اے کلاس قیدی کا دوست ہوں آگے بڑھ کر کہا۔

"چلیں صاحب۔ جب آپ سگریٹ پی چکیں تو پھینکئے نہیں۔ مجھے دیجئے۔"

دوسرے لڑکے نے کہا۔

"نہیں بابو جی۔ اسے نہ دیجئے۔ یہ سالا بھنگی ہے۔ اسے روز شام کو صوبے دار تین بیڑیاں دیتا ہے۔"

رفیق نے اس کے سر پر ایک چپت لگائی اور بولا۔

"بھنگی ہو گا تیرا باپ ـــ سالے ـــ تو بھی تو بھنگی کا کام کرتا ہے۔"

میں ابھی سمجھ نہیں سکا تھا کہ لونڈے ایک دوسرے کو بھنگی کیوں بنا رہے ہیں اس وقت رمضان نے مجھے بتایا کہ جو قیدی جیل میں بھنگی کا کام کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے تو اسے جیل کی طرف سے روزانہ شام میں تین بڑیاں بطور تنخواہ دی جاتی ہیں بڑی کی طلب کچھ ایسی ظالم ہوتی ہے کہ اچھے اچھے شریف اور سید زادے تک بھنگی بن جاتے ہیں ——— ایک بڑی کی خاطر بدفعلی جیسے شرمناک فعل پر آدمی تیار ہو جاتا ہے تو سنڈاس اور گندی نالیاں صاف کرنے میں اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

رمضان مجھے ابھی رازداں بنا ہی رہا تھا کہ چھوکرا پارٹی کا سب سے بدمعاش لونڈا جس کی ایک آنکھ کانی اور ایک پاؤں لنگڑا تھا میرے قریب آ کر بولا۔

"بابو جی ——— تم ہم کو ایک ٹوٹا (سگریٹ کا ٹکڑا) دے گا تو ہم تم کو ایک دم فس کلاس (فرسٹ کلاس) گانا سنائے گا۔ ڈانس بھی دکھائے گا۔"

میرے جواب دینے سے پہلے لنگڑا اپنی ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر اور اپنی اکلوتی آنکھ نچا نچا کر گانے لگا۔

چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے
پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے

لنگڑے کی عمر زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس ہو گی لیکن زندگی کے

بڑے بڑے اور بدترین کاموں میں وہ مجھ سے شاید ہمارے بزرگ چوہدری سے بھی زیادہ تجربہ کار تھا۔ اس مختصری عمر میں وہ شاید کوئی چوتھی بار جیل میں آیا تھا۔

میں نے لنگڑے کو قریب بلا کر پہلے تو سگریٹ کا ٹوٹا دیا اور پھر پوچھا۔

"اچھا بھئی لنگڑے خاں ایک بات تو بتاؤ۔ کیا یہ سچ ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں تم چار بار جیل میں آئے ہو۔"

"بابو جی۔ جیل میں جو مجا ہے وہ اکھی کراچی میں کہیں نہیں ہے۔ ادھر ملا اپن کو تین وقت روٹی ملتی ہے سونے کو کمبل ملتے ہیں باہر تو یہ نہیں ملتا۔ اپنا ادھر کوئی مائی باپ بھی نہیں ہے ایک بہن تھی سالی وہ نا معلوم کس کے ساتھ بھاگ گئی۔"

ایک نوعمر لونڈے کا یہ سیدھا سادا جواب مجھے اپنی وطن کی معاشی اقتصادی حالت پر ایک بالراست تبصرہ محسوس ہوا۔ یہ نوعمر اور جاہل اور آوارہ لڑکا جو نہ معاشیات سے واقف ہے اور نہ سیاست سے لیکن پھر روٹی اور کپڑے کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ زندگی کی مجبوریوں نے اسے اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ بتا دیا ہے کہ جیل کراچی سے کہیں زیادہ اچھی جگہ ہے۔

جانے اس کی طرح کتنے آدمی جیل کو لنگر خانہ سمجھ کر اس میں آنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ میں نے لنگڑے سے پوچھا۔

"پہلی بار تم کس طرح جیل میں آئے تھے۔؟"

لنگڑے نے جواب دیا۔

میں نے ایک پان سگریٹ والے کی دوکان سے گولڈ فلیک کی اٹھارہ ڈبیاں چرائی تھیں۔ جو اس حرامی دوکاندار نے مجھے پولیس میں دے دیا۔ اس کے بعد میں اس جیل میں آٹھ مہینے کچے (زیر دریافت ملزم) میں رہا۔ آٹھ مہینہ بعد ایک بار مجسٹریٹ نے مجھے صرف پانچ بید کے لگانے کی سزا دی اور مجھے پانچ پھڑکے لگا کر چھوڑ دیا گیا۔

لنگڑے کے اس جواب نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس کم عمر لڑکے کو آٹھ مہینے تک جیل کی زندگی کا خواہ مخواہ ہی عادی بنانے کے بجائے اگر اسی روز جس دن اس نے چوری کی تھی یہی پانچ پھڑکے لگائے جاتے تو شاید لنگڑا ایک بار بھی جیل نہ آتا اور نہ جیل کا ماحول اس پر کچھ اثر کر سکتا تھا۔

پتہ نہیں یہ کیا راز ہے کہ یہاں گرفتاری اور سزا کے درمیان اتنا لمبا فاصلہ حائل کر دیا جاتا ہے ——؟ میں نے لنگڑے سے پوچھا۔

"اس مرتبہ تم کس جرم میں اندر آئے ہو؟"

لنگڑا بڑی بے حیائی سے بولا۔

"ریگل سینما کے پاس ایک سیٹھ کا پاکٹ مارا تھا"

میں نے پوچھا۔ "تم پاکٹ مارنا بھی جانتے ہو۔؟"

لنگڑے نے کہا۔ "بابو جی۔ پاکٹ مارنا تو میں نے جیل میں سیکھا تھا۔ ایک

قیدی تھا ہمارے ساتھ۔ وہ بڑا فس کلاس پاکٹ مار تھا۔ اس نے مجھے سکھایا ہے۔"

میں نے یوں ہی پوچھا۔ "اس مرتبہ تم نے کیا سیکھا ہے؟"

میں یہ سمجھ رہا تھا کہ لنگڑا کہے گا کہ صرف بھنگی بننا سیکھا ہے۔ لیکن لنگڑے نے خلاف توقع جواب دیا۔

"اس مرتبہ علی داد نے مجھے نقب لگانا سکھایا ہے تم دیکھ لینا بابو جی اب کہ جب باہر نکلوں گا تو پہلے ہی دن کسی نہ کسی کوٹھی میں نقب ضرور لگا دوں گا۔"

میں نے لنگڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ "شاباش لنگڑے شاباش"۔ انسانیت میں تو تم نقب لگا رہے ہو۔ کوٹھی میں نقب لگانا تمہارے لئے بہت آسان ہے۔"

عین اس وقت جیل کی قلوپطرہ عورتوں کے بارک سے باہر نکلی۔ قبل اس کے کہ میں رمضان کو آواز دوں۔ دس بارہ سالہ لنگڑا سینے پر ایک ہاتھ مار کر بڑے تجربہ کار عیاش آدمی کی طرح پکارا۔

"ہماری گلی آنا ———— اچھا جی۔"

جیل کی قلوپطرہ مسکراتی ہوئی مہاڑی کی طرف چلی گئی۔

(۱۷)

اے کلاس میں مجھے گھریلو ماحول تو میسر آ گیا تھا لیکن مجھے کچھ ایسی ہی
الجھن ہو رہی تھی جیسے کسی تھرڈ کلاس میں سفر کرنے والے مسافر کو سیکنڈ یا فرسٹ
کلاس میں بٹھا دیا گیا ہو۔ میرے اے کلاس کے ساتھی اونچے اور اعلیٰ متوسط طبقے
کے لوگ تھے۔ اس لئے اے کلاس یا طبقاتی غرور نے ان کی زندگیوں میں تکلفات
اور علیحدگی پسندی کے ایسے خول چڑھا رکھے تھے کہ ان سے بے تکلف ہونے کے
لئے بھی ایک خاص قسم کے تکلف کی ضرورت تھی۔ میرے سارے نئے ساتھی
بڑی لے دے قسم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ تو بھی بڑے تکلف
سے ہنستے تھے۔ تو بھی تکلف سے ___ ہر شخص بڑا اینٹھا سا رہتا تھا۔
میں سوچنے لگا یا اللہ اس سے اپنا سی کلاس ہی اچھا تھا۔ وہاں اتنی گہما گہمی اتنی

رونق اور اتنی ہما ہمی ہوتی تھی کہ جی کو بہلاتا تھا۔ دن تو گزرتا تھا ___
یہ اے کلاس تو کسی پرانے بادشاہ کا مقبرہ معلوم ہوتا تھا۔ جس کے گنبدوں میں
ہم چمگادڑوں کی طرح چپ چاپ لٹکے ہوئے ہیں۔ سناٹا، خاموشی، اداسی
غم ___ اے کلاس گویا قید خانہ تھا۔

مجھے احمد علوی اور غلام حیدر ناز اکبر آبادی خاص طور پر بہت یاد
آنے لگے کیونکہ یہ میرے ہم مذاق ہیں۔ ان سے میرا دل لگ گیا تھا۔

پانچ چھ روز تک اذیت ناک تنہائی پھر مجھے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے
تنگ کرتی رہی۔ وہ گویا میرے لئے ایسی بیوی بن گئی تھی جس کو زبردستی مجھے بیاہ
دیا گیا ہو ___ میں خوش رہنے کی بڑی کوشش کرتا تھا لیکن میرے اطراف
سارے پڑھے لکھے اونچے اونچے طبقے کے لوگ تھے۔ اس لئے وہ جیل کی
بھیانک زندگی کے بارے میں ہمیشہ متفکرانہ انداز میں سوچا کرتے تھے اور ہر
دم اداس اور افسردہ رہتے تھے۔ اس لئے ان کے درمیان مجھے کوئی کوفت
ہوتی رہتی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ ایک افسردہ دل آدمی ساری محفل کو افسردہ
کر دیتا ہے۔ چہ جائیکہ یہاں میرے علاوہ آٹھ افسردہ دل آدمی تھے۔ اے
کلاس میں سوائے باہر آنے جانے کے زندگی کی ساری آسائشیں مہیا تھیں۔
اور خدمت کے لئے دو قیدی اور پھاٹک پر ایک واچ مین۔ دھوبی اور
حجام کا بھی انتظام تھا لیکن زندہ دل زندگی مفقود تھی جو سی کلاس قیدیوں

میں پائی جاتی ہے۔

ساتویں آٹھویں دن جب میں سو کر اٹھا تو بی کلاس قیدی رمضان نے بتایا کہ آج ہمارا واچ مین منظور چھوٹ رہا ہے ـــــ منظور اسٹور روم میں قیدی لباس اتار کر اپنے کپڑے پہن آیا تھا جو گرفتاری کے دن اس کے جسم پر تھے۔ میں نے منظور کو نصیحت کی کہ دیکھو بھئی ـــــ اب پھر کبھی جیل کا رُخ نہ کرنا۔ ایک شریف آدمی کی طرح کوئی کام دھندا اختیار کر کے اچھی زندگی گزارنا ـــــ یوں جیلوں میں زندگی کو سڑاتے پھرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

منظور نے مشورے کو غور سے سنا۔ اور بڑے ادب سے سلام کر کے چلا گیا۔ منظور کو جیل سے رہا ہوتے دیکھ کر مجھے ایک قسم کی وحشت ہو رہی تھی۔ حسد کا جذبہ دل میں ابھر آیا تھا کہ اب یہ باہر جائے گا۔ اپنے گھر والوں میں پہنچ جائے گا۔ اپنے دوستوں سے ملے گا۔ اس کی زندگی جو عرصے سے جیل کی چار دیواری میں سکڑی ہوئی تھی۔ پھیل کر بے انتہا وسیع ہو جائے گی وہ ساری کراچی میں گھومتا پھرے گا۔ صرف کراچی کی کیا بات ہے وہ چاہے تو سارے پاکستان میں جہاں جی چاہے جا سکتا ہے۔ منظور سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن دل میں حسد کا دیو بار بار یہ چیخ رہا تھا کہ منظور آزاد نہ ہوتا تو اچھا تھا اور جب تک میں قید ہوں سب کو قید رہنا چاہیئے۔

دل بڑا ہی وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ اور میں گنگنا رہا تھا۔

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اسی اثنا میں صوبیدار ہمارے وارڈ میں آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"سناؤ بھئی صوبیدار پرانے واچ مین کی جگہ نئے واچ کا بندوبست کیا ہے۔ یا نہیں ـــــ؟"

صوبیدار نے کہا۔

"ابھی ہم تو فٹافٹ بندوبست کر دیتے ہیں ـــــ نیا واچ مین تو پھاٹک پر موجود ہے ـــــ"

کون نیا واچ مین ـــــ؟ میں نے کھولی سے باہر نکل کر دیکھا تو خوشی سے چیخ پڑا۔

"ارے غلام حیدر ناز اکبر آبادی ـــــ!"

غلام حیدر نے مسکراتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ اب وہ عجیب معلوم ہو رہا تھا اس کے سر پر ایک سفید سی لمبی ٹوپی تھی۔ جس پر کالے تاگے سے لکھا ہوا تھا۔

"WATCHMAN"

غلام حیدر نے کہا۔

"جلیس صاحب آپ کی جدائی بڑی شاق گزر رہی تھی۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدرت ہم دونوں پر بڑی مہربان ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ تمہیں ایک بار پھر اپنے قریب دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ آؤ میں تمہیں چائے پلاؤں۔

غلام حیدر نے جواب دیا۔

دیکھئے میں آپ لوگوں کی خدمت کے لئے مامور ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ کھانے پینے اور بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ صوبیدار دیکھ لے گا تو مجھے سزا ملے گی۔

میں نے کہا۔

"ارے تم اس کی فکر نہ کرو۔ صوبیدار سے میں کہہ دوں گا کہ تم اس وارڈ کے دوسرے قیدیوں کے خدمت گار ہو سکتے ہو۔ مگر تم میرے لئے بھائی یار دوست ہو۔ آؤ ——"

وہ میری کھولی میں آگیا۔ میں نے تھرموس نکال کر اسے چائے کا ایک گرم گرم پیالہ دیا اور بولا۔

"میرا کھانا میرے گھر سے آتا ہے۔ یہاں سی کلاس کے کھانے میں تم جیسا شریف آدمی تو بھوکوں مرتا ہو گا۔ اسلئے تم میرے ساتھ تینوں وقت کا کھانا کھایا کرو"

غلام حیدر کے ساتھ اے کلاس میں میرے دن اچھے گزرنے لگے۔ لیکن میرے نئے ساتھیوں کو میری غلام حیدر سے دوستی سخت ناگوار تھی کہ میں نے ایک ادنیٰ واچ مین کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ اس سے اے کلاس کا وقار متاثر ہوتا ہے۔

ایک دو بار پردھان سیٹھ اور چوہدری اسماعیل صاحب نے کچھ نرم اور کچھ گرم لہجے میں مجھے ڈانٹا بھی کہ یہ تم کیا کرتے ہو۔ تمہیں اپنی کلاس کا تو کچھ خیال کرنا چاہیئے۔ ایک سی کلاس کے قیدی کے ساتھ بیٹھ کر تم اس کا دماغ خراب کر رہے ہو۔ وہ اب تمہاری طرح ہمیں بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ ہم تمہاری وجہ سے خاموش ہیں ورنہ ابھی جیلر سے رپورٹ کر دیں گے"۔

میں انہیں سمجھاتا کہ دنیا میں کوئی انسان سی کلاس یا اے کلاس نہیں ہوتا۔ یہ صرف جیل میں ہوتا ہے۔ یا پھر یہ ساری دنیا انسان کیلئے جیل بن گئی ہو تب کوئی اے کلاس ہوتا ہے۔ اور کوئی سی کلاس —— اور سنو لئے پردھان سیٹھ اور چوہدری عالی مقام —— میں جیل میں آیا ہوں کہ میں طبقاتی تقسیم کا مخالف تھا کیا آپ حضرات نے میرے اسباب گرفتاری میں یہ جملہ نہیں پڑھا ہے کہ میں طبقاتی نفرت کا پرچار کرتا ہوں" —— اسکے بعد مجھ سے یہ کہنا کہ میں غلام حیدر سے یا کسی بھی نام و نہاد سی کلاس انسان سے برابری کا برتاؤ نہ کروں بالکل عبث ہے۔

پردھان جی کیونکہ سیٹھ تھے اور اسماعیل صاحب چونکہ چوہدری تھے اسی لئے وہ میرے استدلال سے مطمئن نہ ہو سکے۔

ایک دن کھولی نمبر ۵ میں زور سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ جیسے لڑائی اور تکرار ہو رہی ہو۔ میں کھولی نمبر ۵ میں گیا تو دیکھا کہ عزیز حسین غلام حیدر پر بُری طرح برس

رہا ہے اور اسے حرامزادہ اور سؤر کا بچہ تک بنا چکا ہے۔ تو مجھے بڑا غصہ آیا اور میں غلام حیدر کیطرف سے عزیز حسن عابدی سے لڑ پڑا۔ بات بہت معمولی تھی۔ عزیز حسن نے غلام حیدر سے کہا تھا کہ میرا تولیہ دھو ڈالو۔ غلام حیدر نے جواب دیا میں دھوبی نہیں ہوں وارڈ مین ہوں ـــ آپ تولیہ دھوبی خانے بھجوا دیجئے لیکن میرے لطف و کرم کے باعث عزیز حسن ـــ غلام حیدر سے بہت جلا تھا اسلئے اس نے غلام حیدر کو پہلے تو دھوبی بنانا چاہا اور نہ بنا سکا تو حرام زادہ اور سؤر کا بچہ بنا دیا۔

غلام حیدر زار و قطار رو رہا تھا کہ زندگی میں جو گالیاں اسکے والدین نے بھی نہیں دی دیں آج وہ گالیاں سننی پڑ رہی ہیں یا پھر جو گالیاں وہ اپنے ڈیڑھ درجن ملازموں کو ہر وقت دیا کرتا تھا آج خود اسے واپس مل رہی ہیں۔ میں بڑی دیر تک اسکی دلجوئی کرتا رہا اور اس نے ہچکیاں لے لے کر اپنی خودداری کے اتنے واقعات سنائے کہ میرا دل پسیج گیا اور میں بھی کچھ روہانسا ہو گیا۔

میں اسے اپنی کھولی میں لے آیا۔ تھرموس میں اب ایک ہی پیالی چائے باقی رہتی تھی اور شام کی چائے آنے میں پانچ چھ گھنٹے تھے۔ لیکن غلام حیدر کے غم غلط کرنے کی خاطر میں نے تھرماس کا آخری پیالہ بھی اسے دے دیا۔

غلام حیدر چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے لے کر پھر اپنی خاندانی عصمت اور شرافت کے واقعے سنانے لگا۔ ایک واقعہ تو واقعی اس کی خودداری کا یادگار واقعہ ہے اس نے واقعہ یوں سنایا کہ ایک دن میں علی گڑھ کے مرحوم وائس چانسلر

ڈاکٹر سر ضیاء الدین سے ملنے گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر والے بھی یعنی خواتین بھی مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ میں سیدھے اندر زنان خانے میں پہنچ گیا ڈاکٹر صاحب اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے مجھے دیکھتے ہی جھوٹے ہاتھ سمیت اٹھ کھڑے ہوئے بغلگیر ہوئے اور زبردستی اپنے ساتھ کھانے میں بٹھا لیا۔ کھانا ختم ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ بھئی غلام حیدر۔ تمہاری عمر بہت بڑی ہے بڑے بلند اقبال ہو ابھی ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا کہ تم آموجود ہوئے مجھے تم سے ایک بہت ہی ضروری کام ہے۔

میں نے عرض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب میں آپکا بچہ ہوں۔ آپ حکم کیجئے تو میں..."

ڈاکٹر صاحب نے بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں۔ اسی لئے تمہاری شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا"۔

"ہاں تو کام یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کیلئے چندے کی ضرورت ہے دو گے ؟..."

میں نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کو بالکل ہی نئے طریقے سے جواب دینا چاہئیے اسلئے جیب سے چیک بک نکالی اور ایک بلینک چیک پر دستخط کر کے ڈاکٹر صاحب کی طرف چیک بک اور اپنا پارکر ففٹی ون قلم بڑھا دیا کہ میرے دینے کی بات بیکار ہے آپ بتائیے آپ کیا لے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بینک چیک پر صرف پچاس روپے لکھے میں ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر چیک بک کھولی اور مزید پچیس ہزار روپے کا چیک کاٹ دیا اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کی بیوی بھی باہر سے آ گئیں اور مجھے دیکھ کر عادتاً خوش

مزاجی سے کہہ دیا۔

"ارے تم ـــــ بھئی آئندہ تم ہمارے یہاں نہ آیا کرو"۔ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتی تھیں کہ جب تم ہمیشہ ہمارے ہاں نہیں آتے تو کبھی کبھی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی بیگم کا یہ جملہ محض ایک شائستہ اور تیکھا مزاح تھا لیکن اتنا نازک مذاق بھی میرے دل میں تیر کی طرح چبھ گیا۔ اس وقت تو میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ لیکن اس کے بعد پھر کبھی ہزار دعوت ناموں کے باوجود میں نے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا کبھی رُخ نہیں کیا۔

واہ رے غلام حیدر واہ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ واقعہ تو نے مجھے خواہ مخواہ سنایا ہے اس واقعہ کو سُنکر تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی عزیز حسن عابدی کی طرح پُکار اُٹھوں۔

لے غلام حیدر...... تو لیہ ڈھولاؤ...... حرامزادہ ...... سور کا بچہ۔

اسی دن سہ پہر عابدی اور اے کلاس کے دوسرے قیدیوں نے غلام حیدر کے خلاف جیلر کے پاس رپورٹ کردی کہ وہ محض نکما شخص ہے کوئی کام نہیں کرتا اسکے علاوہ کوئی دوسرا ڈیچ مین مقرر کردو۔ مجھے بات کی خبر ہو چکی تھی۔ میں بھی جیلر کے پاس گیا۔ کافی ردوقدح کے بعد جیلر نے میری بات مان لی اور غلام حیدر کی بدلی نہیں کی۔ یہ میری فتح نہیں تھی بلکہ غلام حیدر کی فتح اور سارے اے کلاس قیدیوں کی شکست تھی۔ اس شکست کے غم و غصہ نے میرے سارے نئے ساتھیوں

کو میرا دشمن بنا دیا۔ لیکن میں نے کہا ـــــ چلو جی کیا پرواہ ہے ـــــ ایک ہم مذاق دوست سارے بدمذاقوں سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔

اس واقعہ کے بعد سے دوسرے سارے قیدیوں نے میرا سوشل بائیکاٹ کر دیا کوئی نہ مجھ سے بات کرتا تھا اور نہ کوئی میرے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا۔

لیکن غلام حیدر کی باتوں میں شطرنج کی چالوں کا مزا تھا ـــــ!!

ہمارے بزرگ ساتھی چوہدری اسماعیل نے سمجھوتہ کی ایک کوشش کی اور مجھے سمجھایا کہ آپ بھی کس نِکمّے کی خاطر ہم سب سے لڑ پڑے۔ ارے بھائی۔ غلام حیدر کوئی شریف اور معزز آدمی نہیں ہے میں آگرہ میں چار برس رہ چکا ہوں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ آگرے کی پھراج کا دلا ہے۔

غلام حیدر اور پھراج رنڈی کا دلا ـــــ!

ابھی چوہدری جی آگے کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غلام حیدر پر جھوٹا ہونے کا الزام تو ایک حد تک مجھے گوارا ہے۔ مگر اس کی شرافت پر کوئی ناجائز حملہ ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ تھا۔ میں نے غصے سے کہا۔

"بس بس چوہدری جی ـــــ اب آگے مجھے موقعہ نہ دیجئے کہ میں آپ کی بزرگی کو بالائے طاق رکھ دوں"۔

چوہدری جی سہم گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی ـــــ اس طرح اور پانچ چھ دن گذر گئے۔ چھٹے یا ساتویں دن کوئی دوپہر کے قریب میں کھانا کھا کر سونے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ غلام حیدر دوڑا دوڑا ہانپتا میری کھولی میں آیا۔ خوشی سے اسکی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اپنی خوشی کو دبائے اور چڑھتی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولا۔

جلیس صاحب آج مجھے ایک مہینہ اٹھارہ دن کی معافی مل گئی ہے میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ بعض قیدیوں کو جیل کمیٹی نے معافی دینے کا وعدہ کیا تھا آج اچانک اوپر سے حکم آ گیا ہے۔ اب۔ اب میری رہائی میں صرف دو دن باقی رہ گئے ہیں۔

یہ خوشخبری ایک بجلی کی طرح میرے دل پر گری میرے حواس کو خاکستر کر گئی ـــــ تو گویا یہ کہنا چاہیے کہ غلام حیدر دو دن بعد مجھے پھر جیل کے تکلیف خانے میں اکیلا چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میں نے اسکی رفاقت حاصل کرنے کے لئے ساتھیوں سے لڑائی مول لی ہے۔ اور اب وہ اتنی گراں رفاقت بھی اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔

لیکن میں نے پیشانی پر ہلکی سی شکن ڈالے بغیر مسکرانے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

مبارک ـــــ مبارک دوست تمہیں آزادی مبارک ہو ہم بھی کبھی اس

قید سے رہا ہوں ـــــ تو پھر تمہارے ساتھ جشن آزادی منائیں گے۔ اس نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں ـــــ ضرور آپ جس دن رہا ہو جائیں اسی دن سیدھے میری دوکان برف خانے پر، یا ٹرانسپورٹ آفس چلے آئیے۔ تکلف و تکلف قطعاً نہ کیجیے۔ گا میں اپنا ٹیلیفون نمبر لکھوا جاؤں گا ـــــ اور ـــــ میں تو باہر نکلتے ہی آپ کی رہائی کی کوشش کروں گا۔ اگر آپ کیلئے مجھے ایک لاکھ روپے کی ضمانت دینی پڑے تو میں دوں گا۔ میں چھوٹتے ہی آپ کی خاطر سیدھا وزیر اعظم کے پاس جاؤں گا اور انہیں مجبور کر دوں گا" کہ آپ کو فوراً رہا کر دیں۔ جلیس صاحب آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں آپ کے لئے کیا نہ کروں گا"۔ وہ مسرت سے تیز چلتی ہوئی زبان سے نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیونکہ میں تو جانے کہاں پہنچا ہوا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ کل کے بعد پرسوں کا دن طلوع نہ ہو اور غلام حیدر رہا نہ ہو لیکن پرسوں کا دن طلوع ہو گیا۔ غلام حیدر بڑا خوش تھا۔ بڑا مسرور۔ شاداں فرحاں اس کے قدم زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے آج سارے لے کلاس قیدیوں نے اس سے صلح کر لی سب اس کی منتیں کر رہے تھے کہ باہر جانے کے بعد ہمارے گھر بھی جائے اور ہمارے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کو ہماری خیریت سے مطلع کرے اور ان سے کہے کہ ہماری ضرورتوں کا فلاں فلاں سامان اب کی ملاقات پر ساتھ لائیں۔

غلام حیدر نے ہر ایک کے گھر کا پتہ ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا اور اس

خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اپنی خوشی کو دبانے اور چڑھتی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کاغذ کو نیفے میں چھپا لیا۔ سب اسے خدا حافظ کہہ رہے تھے لیکن میری آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔ غلام حیدر نے مجھے تسلی دی اور دلاسے کی باتیں کیں اور بظاہر دل گرفتہ چھوٹنے والے قیدیوں کی قطار میں شامل ہو کر جیل کے بڑے پھاٹک کا بغلی دروازہ کھلا اور غلام حیدر جیسے ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اور جیل ایک دم تاریک ——— اداس اور بھیانک ہو گئی۔

(۱۸)

شام تک میں بڑا ہی دل گرفتہ اپنی کھولی میں پڑا رہا۔ عبدالقادر خان صاحب نے اور عابدی نے کئی بار مجھے شطرنج کھیلنے کی دعوت دی۔ رمضان نے کہا جیل کی قلو پطرہ بڑی دیر سے عورتوں کے بارک کے پھاٹک پر کھڑی ہے۔ آؤ کمرہ دیدار یار سے آنکھیں سینکیں۔ لیکن میرا دل غریب آدمی کے چراغ کی طرح بجھا ہوا تھا میں اپنی کھولی سے باہر نہیں نکلا۔ دن بھر چارپائی پر پڑے رہنے سے طبیعت میں ایسی کسل پیدا ہو گئی تھی کہ ہلکا ہلکا بخار بھی چڑھ آیا تھا۔

شام کھولیوں میں بند کئے جانے سے پہلے کوئی پندرہ بیس منٹ پہلے مہاڑی مقدم شاہ جی آیا اور بولا۔

"چلو جی جلیس صاحب۔ تمہاری ملاقات آئی ہے۔"

میں حیران ہو گیا۔ ملاقات ——— ! آج تو میری ملاقات کا دن نہیں ہے!

شاہ جی نے کہا۔

"اسپیشل ملاقات ہے۔ میرا خیال ہے آپ کی بیوی آئی ہے۔"

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تو گویا بے چاری کو بتا دیا گیا کہ میں جیل میں ہوں۔ میں نے اپنے دوستوں کو کتنی تاکید کی تھی کہ اسے خبر نہ ہونے پائے کہ میں جیل میں ہوں۔ چلو ٹھیک ہے ــــ آخر کب تک چھپایا جاتا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جیلر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جیسے ہی میری نظر فاطمہ پر، شہریار پر، نذیا پر، بی بی پر اور زبیدہ پر پڑی سب نظر کی حدت سے پگھل کر آنسوؤں کے قطرے بن گئے۔ میں نے جی کڑا کر کے ان آنسوؤں کو پی لیا۔ فاطمہ نے برقعے کا نقاب اُلٹ دیا اور میں اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں ڈوبنے لگا۔ بچے مجھ سے اس طرح چمٹ گئے تھے کہ میں ایک بار آور درخت کی طرف گھنا گھنا نظر آ رہا تھا۔

اتنے قریب سے ان پیاری پیاری صورتوں کو دیکھنے کے باوجود مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں انہیں بہت دور سے دیکھ رہا ہوں جیسے یہ سب میری حدِ نظر پر کھڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ۱۲ فروری کا دن پھر لوٹ آیا ہے۔ میں ایروڈرم کے برآمدے میں کھڑا ہوں۔ ایئر انڈیا کا وائکنگ سامنے کھڑا ہے۔ اس کو سیڑھی لگا دی گئی ہے۔ وائکنگ کا دروازہ کھل گیا ہے۔ فاطمہ شہریار، نذیا، بی بی، افتخار اور زبیدہ کی دھندلی صورتیں نظر آ رہی ہیں پھر ان چہروں پر سے آہستہ آہستہ دوری کی دھند

چھٹتی جا رہی تھی اور اب چہرے صاف اور چمکیلے ہو گئے تھے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری جگہ کا کوئی گوشہ کم ہے۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

افتخار کہاں ہے ــــ؟

فاطمہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اسے سخت بخار ہے ــــ اور مجھے بھی بخار ہے۔ جس دن سے آپ غائب ہوئے ہیں اس دن سے مجھ پر قیامت پہ قیامت ٹوٹ رہی ہے میں اس اجنبی شہر میں تنہا کس طرح جی سکتی ہوں۔

بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟

میں نے سر جھکا لیا اور بولا۔

مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ ان لوہے کی سلاخوں سے پوچھو۔ ان پتھریلی دیواروں سے پوچھو۔ ان وردی پوش آدمیوں سے پوچھو ــــ

فاطمہ نے کہا۔

میرے گلے میں صرف ایک ہار باقی رہ گیا ہے۔ باقی سب فروخت ہو گیا ہے۔

میں نے کہا۔

اس ہار کو بھی بیچ دو۔ بلکہ اس ہار کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے گلے

میں ڈال دو۔

جس نے تم پر عارضی بیوگی طاری کر رکھی ہے ـــــــــــ

اور جب افتخار میرا جگر گوشہ افتخار مرجائے تو ـــــــــــ

تو ....

معاً مجھے احساس ہوا کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ مجھے تو اس وقت تسلی اور دلاسے کی باتیں کرنی چاہئیں مجھے تو اس کے آنسو پونچھنے چاہئیں میں نے فوراً لہجہ بدل کر کہا۔

"دیکھو فاطمہ میں معافی چاہتا ہوں۔ کہ میں کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ مصیبت کا ہمت سے مقابلہ کرو۔ ہم پر یہ جو کچھ ظلم ہوا ہے۔ ہم اس کے جواب میں کیا کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم غریب آدمی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج جو ظلم ہم پر موت بن کر مسلط ہے۔ وہ بہت جلد اپنی موت آپ مرجائے گا۔"

فاطمہ جیسے میری باتیں نہیں سُن رہی تھی۔ اس لئے اس نے پوچھا۔

"اس دوزخ سے آپ کب نکلیں گے ـــــــ؟"

میں نے ایک لمبی سانس لے کر جواب دیا۔

"پتہ نہیں ـــــــ لیکن سنو۔ شاید میں بہت جلد رہا ہو جاؤں

گا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ اور ہاں اگر میں جلدی نہ چھوٹ سکوں اور زندگی تم پر ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائے تو پھر ـــــــــ

تو پھر تم خودکشی کر لینا ـــــ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے

اور اب تم جاؤ ـــــــــــ پھر کبھی مجھ سے ملاقات کرنے نہ آنا۔

ایسی ملاقات کا کیا فائدہ جو غم کو اور بڑھاتی ہے۔ جو کھوئی ہوئی یاد اور کھوئے ہوئے پیار کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو اور زیادہ بھڑکاتی ہے۔"

فاطمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل پگھل کر آنسو ہوا جا رہا تھا۔ مگر میں کیا روؤں ـــــــ میں ہرگز نہیں روؤں گا ـــــــ میں نے ایک شقی القلب سنگدل انسان کی طرح اسے ڈانٹا۔

"روتی کیوں ہو ـــــــ تم یہاں رونے آئی ہو۔ کیا تم مجھے بھی رُلانے آئی ہو فاطمہ ـــــــ!!! اگر تم اس لئے یہاں آئی تھیں تو ـــــــ

تو اب میں آگے کیا کہوں کیوں بولوں ـــــــ؟

لی لی نے میرے گلے میں ننھی ننھی باہوں کا ہار ڈال کر کہا۔ بابا۔ مجھے ٹافی لے دو۔

زویا بیچ میں بول پڑی ـــــــ نہیں بابا ـــــــ یہ کھانا نہیں کھاتی۔ ضد کرتی ہے۔ اس لئے امی نے کہا کہ اسے ٹافی نہیں دینی چاہیئے۔

میں ضد نہیں کرتی۔ مجھے لے دیجیے ٹافی،

ٹافی۔ جیل۔ ٹافی۔ پبلک سیفٹی ایکٹ ــــ!!

میں نے شہریار، زویا، بی بی ــــ اور زبیدہ کے گالوں کو چوم چوم کر وعدہ کیا۔ کہ میں ان کے لئے ٹافیوں کے ڈبے کے ڈبے لا دوں گا

میرے بچو! دوکان بند ہو گئی ہے ــــ شام ہو گئی نا ــــ اس لئے کل بڑی بڑی میٹھی میٹھی ٹافیاں لا دوں گا ــــ اب جاؤ ــــ گھر جا کر سو جاؤ۔

شہریار بولا۔

نہیں آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے ــــ آپ امی سے کیوں ناراض ہیں ــــ؟ اب آپ ہمارے پاس آتے نہیں۔!

میں نے اس کے سر پر اس کے ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ــــ

بیٹا ــــ میں ابھی تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ مجھے یہاں ابھی بہت کام ہے۔

زویا نے پوچھا۔

"بابا ــــ کیا یہ آپ کا دفتر ہے ــــ؟"

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں بیٹی ــــ یہ میرا دفتر ہے۔

اسی اثناء میں جیلر نے کہا ــــ

"چلیئے اب بس! آپ کی ملاقات کا وقت ختم ہو چکا"

فاطمہ نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا لیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے زبردستی بچوں کے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ جیسے کوئی گلچیں کسی بیل سے پھولوں کو نوچ نوچ کر الگ کرتا ہے۔ فاطمہ اور بچے جیل کے آہنی پھاٹک سے باہر چلے گئے اور میری آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کا گہرا کہر چھا گیا۔

میں اپنی کھولی میں لوٹ آیا۔ رات آہستہ آہستہ جیل کی دیواروں پر سے کھسکتی ہوئی اندر کھولیوں میں داخل ہو رہی تھی۔

میں بستر پر گر پڑا ــــ

دل زخمی تھا۔ جیسے میرے پیاروں نے میرے دل کے زخموں کے سارے ٹانکے ادھیڑ دیئے تھے۔ اب میرے اطراف اندھیرا تھا۔ آنسوؤں کے ستارے تھے۔ اور ایک تلخ یاد کا انتہائی پر ہول سناٹا ....

(۱۹)

یوں تو میں پہلے ہی سے بخار میں تپ رہا تھا کہ اس وصال یار نے
جو دراصل وصالِ ہجر انگیز یا قرب مذاق آمیز تھا۔ اس نے تو جیسے جسم
میں آگ ہی آگ بھر دی۔

رات بھر میں جنگل کے الاؤ کی طرح جلتا رہا۔ جس کی آگ تاپنے
والا کوئی نہ ہو۔

صبح سویرے اٹھنے کی بڑی کوشش کی لیکن اٹھا نہیں گیا۔ عابدی
صاحب اور سارے ساتھی میری کھولی میں آئے اور چوہدری اسماعیل
صاحب نے بالکل میرے بزرگ کی مانند میری صحت یابی کی دعائیں مانگیں
اور پھر سلیٹ پر ڈاکٹر کو میری کیفیت لکھ بھیجی۔ جس کے جواب میں اسپتال

کے دو ملازم قیدی ایک اسٹریچر اٹھا لائے۔ اسٹریچر کو دیکھ کر میری
حالت اور خراب ہو گئی۔ میں زندگی میں آج تک کبھی اتنا سخت بیمار نہیں
پڑا تھا کہ اسٹریچر پر اٹھا کر اسپتال میں شریک کروایا جاؤں ——
میں نے صاف انکار کر دیا۔ کہ میں اسٹریچر پر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں
پیدل ہی جاؤں گا۔ چاہے ایسی حالت میں اسپتال تک پیدل جانے
میں میرا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اسپتال چلا گیا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب کے پاس
میرے دوست سوبھو گیان چندانی اور شرف بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ شرف
جو اسپتال میں اسسٹنٹ ڈاکٹر کا کام انجام دیتا تھا۔ مجھ سے کوئی بات
نہیں پوچھی۔ ایک بڑا سا رجسٹر اٹھا لایا۔ اور اس میں میرا نام وزن عمر قد سب
کچھ لکھ لینے کے بعد ایک قیدی سے بولا۔

"صاحب کو بیڈ دکھاؤ"

میں نے تند لہجے میں شرف سے پوچھا۔

یہ کیا مذاق ہے۔ کیا آپ نے مجھے اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ میں
زندگی میں ایک بار بھی اسپتال میں رجوع نہیں ہوا۔ اب کیوں مجھے اس جہنم
میں جھونکا جا رہا ہے نہیں —— آپ دوائی دے کر مجھے میری کھولی
واپس بھجوا دیجیے۔

ڈاکٹر نے بیڑی کا کش کھینچ کر جواب دیا۔

"ماسٹر چور بازار (یہ ایک میرے ناول کا نام ہے) یہاں آپ نہ صرف ایک مریض ہیں۔ بلکہ ایک قیدی بھی۔ یہاں آپ کی مرضی نہیں چل سکتی۔ آپ چپ چاپ وارڈ مین کے ساتھ چلے جایئے۔"

ڈاکٹر چونکہ ایک شریف اور دوست آدمی تھا اسلئے میں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ آپ مجھے اسپتال میں شریک نہ کرایئے۔ اسپتال کے ماحول ہی سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے یہ ماحول میری بیماری میں کمی کرنے کی بجائے اس کو اور بڑھا دے گا۔"

لیکن ڈاکٹر نے ایک نہیں سنی۔ طرفہ یہ کہ سوبھو گیان چندانی اور شرف بھی ڈاکٹر کے ہمنوا تھے کہ نہیں مزدور اسپتال میں شریک کرایا جائے۔ یہ دونوں دوست تو محض شرافت کر رہے تھے۔ کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ اسپتال میں رجوع ہونے کے بعد میں ان سے قریب ہو جاؤں گا اور ان کے ساتھ شطرنج کھیلا کروں گا۔

مجھے زبردستی اسپتال میں شریک کرا دیا گیا۔

اسپتال کیا تھا۔ اچھا خاصہ اصطبل تھا۔ ایک بڑا سا ہال تھا۔ جس میں دس بارہ پلنگ یا دس بارہ مریض قیدی پڑے ہوئے تھے۔ اس ہال سے ملحق وہی کھولی تھی جس میں شریف لے کلاس میں منتقل ہونے سے

پہلے رہا کرتا تھا۔ اور اس کا ساتھی پلوریسی کا مریض غلام علی تھا۔ جس میں زندگی کی شاید آخری چنگاری دہک رہی تھی۔ غلام علی کے بیڈ کے علاوہ جو دوسرا بیڈ خالی تھا وہ مجھے ملا۔ اسپتال میں بھی مجھے طبقاتی امتیاز کا خاص خیال رکھا گیا تھا اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر بس چلے تو شاید یہ لوگ موت کو بھی طبقاتی امتیاز کی زد میں لے آئیں۔ کیونکہ موت کا دعویٰ ہے کہ وہ سب کو برابر کرتی ہے۔ مجھے اسپتال سے زیادہ غلام علی سے وحشت ہو رہی تھی۔ اسکا خطرناک حد تک پیلا چہرہ اور تیلیوں جیسے ہاتھ پاؤں اس کی بڑی بڑی پیلی آنکھیں۔

پھر اگر پلوریسی متعدی مرض ہوا تو ———!

غلام علی کے بیڈ سے میرا بیڈ کافی فاصلے پر تھا لیکن اس کے بیڈ سے کچھ عجیب سا تعفن اٹھ رہا تھا کہ ناک نہ دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ میں شاید میں یہاں سے صحت یاب ہو کر نہیں نکل سکوں گا۔ دن تو جوں توں کر کے کاٹ ہی دیا شام ہوتے ہی طبیعت گھبرانے لگی۔ یہ رات کیسے گزرے گی ——— سامنے سے رات اس طرح میرا اسکلا میری طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ جیسے سر ہلا ہلا کر پوچھ رہی ہو۔

"اب بولو ——— مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔"

عین اسی وقت شرف ہماری کھولی میں آیا اور بولا۔

"تم [illegible] ——— ارے بھائی میں اپنی چارپائی آج

رات یہیں منگوا رہا ہوں۔ آج تو تمہارے ساتھ خوب شطرنج اڑے گی۔"

میرے ہونٹوں پر اطمینان کی لہر مسکراہٹ بن کر دوڑ گئی۔ اسی اثناء میں اسکی چارپائی اور بستر بھی پہنچ گیا۔ باہر سے سپاہی نے تالہ لگا دیا اور ہم نے لالٹین جلائی اور شطرنج کی بساط بچھا کر کھیلنے لگے۔ کھیلتے رہے حتیٰ کہ میرے تین پیدل نے شرف کے بادشاہ کو تینوں طرف سے گھیر لیا۔ بظاہر تو شرف کو مات ہو گئی لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ شطرنج کے پیادے دنیا بھر کے عوام ہیں جنہوں نے بادشاہت کو قید کر لیا ہے۔ بادشاہت کو شکست دے دی ہے۔ اور بادشاہت کو اس دنیا سے نیست و نابود کر دیا ہے۔

ہم پھر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور رات کاٹنے کے لئے باتیں کرتے رہے۔ شرف کی باتیں مجھے لوری کے بول محسوس ہو رہے تھے۔ نیند کی پری جیسے میرے سارے جسم کو دھیرے دھیرے سہلا رہی تھی اور کبھی کبھی پپوٹے آنکھوں پر پوری طرح ڈھنک جاتے لیکن جب شرف نے باتوں کے دوران میں مجھے یہ بتایا کہ جس پلنگ پر میں لیٹا ہوں اسی پلنگ پر کبھی ایک قیدی کا ہارٹ فیل بھی ہو چکا ہے تو میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ نیند کی پری موت کے دیو سے گھبرا کر اچانک دور بھاگ گئی تھی اور میرا دل اچانک زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ جیسے ابھی فیل ہو جائے گا۔

میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں شرف سے پوچھا۔

"تو یہ بیڈ نوس ہے۔ تو یہ بستر بیماری نہیں بستر مرگ ہے — اب کیا کیا جائے بتاؤ ——؟"

شرف نے ایک بیڑی سلگا کر کہا۔

"یار تم نہیں مرو گے چپ چاپ لیٹے رہو۔ اچھا چلو۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ جب موت تمہارے قریب آئے تو مجھے آواز دے دینا میں اسے مار بھگا دوں گا۔"

شرف مجھے ایک ننھے بچے کی طرح تسلیاں دے رہا تھا اور میں خوفزدہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھ رہا تھا کہ نا معلوم اس اندھیرے کی کمین گاہ میں چھپی ہوئی موت کب میرے دھڑکتے ہوئے دل پر کود پڑے اور سانس کا جھولتا ہوا تار ٹوٹ جائے۔

رات موت تو نہیں آئی البتہ موت جیسے ڈراؤنے خواب ضرور آتے رہے۔

صبح سویرے طبیعت اگرچہ گری گری سی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو بڑا چاق و چوبند ظاہر کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے بڑے ہشاش بشاش طریقے سے ملا ایسی لاجواب ایکٹنگ کی کہ ڈاکٹر صاحب کو یقین ہو گیا کہ ان کی دوائی میں یا انکے ہاتھ میں کیا شفا ہے — اب میں نے ڈاکٹر صاحب کی مسیحا نفسی کی بڑی تعریف کی حتیٰ کہ شرف اور سوبھو کے منع کرنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی مجھے تو ایسا لگا جیسے جیل ہی سے چھوٹ گیا ہوں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی کھولی کی طرف گیا کہ کہیں کوئی اور تیز رفتار قیدی مجھے پکڑ کر پھر نہ

اسپتال میں جھونک دے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کہیں الف لیلیٰ کے پیر دوں کی طرح پتھر نہ بن جاؤں۔

میرے سارے ساتھی مجھے واپس اپنی کھولی میں دیکھ کر بڑے حیران تھے کہ یہ کیسی چٹ بیماری اور پٹ صحت یابی ہے ــــــ بھئی واہ ــــــ !

لیکن جس طرح مجھے اپنا عشق حالِ دل اور آنسو چھپانے میں کمال حاصل ہے بالکل اسی طرح میں نے اپنی بیماری کو بھی چھپا لیا۔

سگریٹ کی بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ کل سے میں نے کوئی بھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ اتفاقاً میری نظر سیٹھ رحمت اللہ پر پڑی جنکے ہاتھ میں ۵۵۵ کا ایک ٹن تھا۔ جیل میں ۵۵۵ کا ٹن۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ میں پکارا۔

"سیٹھ صاحب ــــــ ایک سگریٹ ادھار دو گے؟"

سیٹھ صاحب نے مسکراتے ہوئے ٹن کا ڈھکنا کھول کر کہا۔

ایک نہیں پانچ سگریٹ لو کیا ــــــ !

میں نے بھی سیٹھ صاحب کی نقل اڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ سیٹھ صاحب کیا ــــــ !"

میں جانتا تھا کہ سیٹھ صاحب کے پاس روز روز یہ ۵۵۵ کے ٹن کہاں سے آتے ہیں؟ سیٹھ صاحب کیلئے بھی میری طرح صرف پانچ سگریٹ منظور ہوئے تھے لیکن روپیہ جیل کو بھی [illegible] جیل میں [illegible]

بینک اور سرکاری خزانے سے ہزارہا، کروڑہا میل دُور ہوتی ہے۔ لیکن دولت مند جیل میں بھی دولتمند ہوتا ہے۔ ہم روز دیکھتے تھے کہ سپاہی سے لے کر جیل کے بڑے سے بڑے افسر تک سیٹھ صاحب کے سامنے کس طرح بچھے جاتے تھے ہر شخص سیٹھ صاحب کا کام پہلے کرتا تھا۔ سیٹھ صاحب نے شراب اور عورت کے علاوہ جو چیز بھی باہر سے منگواتے تھے فوراً آجاتی تھی ــــــ سیٹھ صاحب اپنی کھولی میں چارپائی پر اسی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھا کرتے تھے۔ جیسے اپنی دکان کی گدی پر بیٹھتے ہوں۔

ان کے اطراف ہر شخص کو کھنچا کھنچا دیکھ کر مجھے یوں نظر آتا تھا۔ جیسے سیٹھ صاحب جیل میں نہیں آئے ہیں۔ بلکہ جیل سیٹھ صاحب میں سمٹ آئی ہے۔

ہائے ری دولت کی قطار ــــــ !!

(۲۰)

ایک دوپہر سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ باہر گڑبڑ نے بالکل ہی سونے نہ دیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ ہماری بارک کے تمام قیدی جمع ہیں اور چیخ رہے ہیں۔

.... اور مارو سالے کو

اس آواز کے ساتھ ہی صوبیدار ایک تہمد باندھے ہوئے ننگے بدن قیدی کی گردن پر زور زور سے بید لگاتا تھا۔ اس قیدی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپایا ہوا تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل ہو گیا لیکن جیسے اس منہ چھپائے ہوئے قیدی کے ہاتھوں اور جسم پر میری نظر پڑی میں چیخا۔

اوئے غلام حیدر ناز اکبرآبادی ـــــ!

میرے سر سے پاؤں تک غصے کی گرم گرم لہریں دوڑ گئیں۔ عابدی نے مجھے دیکھتے ہی بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

لیجئے جلیس صاحب آپکے یارِ غار پھر آ دھمکے ـــــ جانیئے گلے ملنے خاطر تواضع کیجئے یہ آپکے گھر جا کر پچاس روپے بھی وصول کر لائے ہیں کہ آپ کو رہا کرانے کیلئے صوبیدار کو رشوت دینی ہے ـــــ! میں بھونچکا رہ گیا تو اس کمینے نے میری غریب بیوی کو بھی لوٹ لیا۔ حالانکہ میں نے اسکے ساتھ کتنا شریفانہ سلوک رکھا تھا بالکل بھائی کی طرح عزیز رکھتا تھا ـــــ میں نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

کیوں غلام حیدر۔ یہ سچ ہے کہ تم نے میری بیوی سے پچاس روپے اینٹھے؟

غلام حیدر کا سر جھکا ہوا تھا۔ بالکل اثباتی انداز میں۔ لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

پردھان جی نے کہا۔

اس سے کیا پوچھتے ہو جلیس صاحب۔ مجھ سے پوچھیئے مجھ سے۔ یہ حرامی یہاں سے چھوٹتے ہی سیدھے ہم میں سے ہر ایک کے گھر گیا ہے۔ اس سالے نے پتے اس لئے نوٹ کئے تھے۔ آپکے گھر سے پچاس روپے اور میرے گھر سے ایکسو روپے سیٹھ رحمت اللہ کے گھر سے سو روپے عابدی صاحب کے گھر سے پچیس روپے رمضان کے گھر سے بیس روپے بٹورنے کے بعد بھی سالے کی نیت نہیں بھری اور بولٹن مارکیٹ پر ایک آدمی کی جیب کاٹتا ہوا پکڑا گیا۔

صوبیدار نے غلام حیدر کے جبڑے پر ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"سالے کو جیل سے عشق ہے۔ چار دن بھی باہر چین سے نہیں بیٹھتا۔ یہ سالے مردود کا دو سال میں پانچواں ٹائم ہے"!

میں نے حیرت سے پوچھا۔ پانچواں ٹائم ـــــ!

میرا جی چاہا کہ آگرے کے اس رنگین نادہ ایکٹریس مس نرگس اور آگرے والی مشتری بائی کے عاشق۔ ٹرانسپورٹ کمپنی۔ کلاتھ ہاؤس، برف خانے، عالیشان کوٹھی شیڈی بیکر کار کے لکھ پتی مالک اور وزیر اعظم کے دوست کی گردن پکڑ کر صرف اتنا کہہ دوں سنا ہے مشتری کے دتّے ـــــ!!

لیکن میں پوچھ نہ سکا۔ عین اسی وقت میرا حرامی ہمزاد پھر مجھ میں آگیا تھا اور مجھے کہہ رہا تھا ضبط سے کام لو اتنی جلدی غصے میں نہ آؤ۔ دیکھو ذرا اس غلام حیدر کی طرف دیکھو اس غلام حیدر کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ غلام حیدر کو دیکھنے کے بجائے پہلے اسکے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالو اور اس ماحول کے پس منظر میں غلام حیدر کو دیکھو پہچاننے کی کوشش کرو اور سمجھو۔ اگر تم نے اسے پہچان لیا دیکھ لیا اور سمجھ لیا تو مجھے یقین ہے کہ تم اسے بڑی فراخدلی سے معاف کردو گے ــــ غلام حیدر اب بھی معصوم ہے۔ وہ ننگا ہے بھوکا ہے بیروزگار ہے۔ مفلس ہے۔ اس کی گردن پکڑ کر کیا کرو گے گردن تو عریانی کی پکڑو۔ بھوک کی پکڑو۔ بے روزگاری کی پکڑو۔ افلاس کی گردن پکڑو اس کی گردن پکڑو جو غلام حیدر کو جنم دیتا ہے اور سوچو ــــ کہ غلام حیدر ماں کے پیٹ سے تو مشتری کا دلا بن کر نہیں پیدا ہوا تھا۔

میں ہمیشہ کی طرح پھر اپنے ہمزاد کے بہکانے میں آگیا اور میرا جی چاہا کہ دوڑ کر غلام حیدر کو گلے سے لگالوں اور کہوں۔

"غلام حیدر ــــ میرے بھائی ــــ میرے دوست میں نے تجھے معاف کردیا۔ اب تو مجھے معاف کردے"۔

لیکن دنیا کی زبان سے ڈرنے والا ابراہیم جلیس ایسا کس طرح کرسکتا تھا۔ لوگوں سے ڈرنے والا جلیس چپ چاپ کھڑا تھا۔

(۲۱)

ایک صبح کھولی کا دروازہ کھلنے سے پہلے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ رات دم توڑ رہی تھی۔ بڑی تیز اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ جیسے قریب المرگ رات مرنے سے پہلے اتنے تیز سانس لے رہی ہو کہ کھینچتے کھینچتے اس کا تار نفس ابھی ٹوٹ جانے والا ہو۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا۔ مشرقی افق پر اندھیرے بادل چھدرے ہو ہو کر چھٹتے جارہے تھے اور آسمان پر اُجالے کا غبار پھیلتا ہوا معلوم ہوتا تھا صبح کا ستارہ مجھے گھور رہا تھا۔

سویرا ــــ ہائے سویرا کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ سویرا چاہے وہ بادل گھٹتوں والی رات کا ہو یا انسانی زندگی کا سویرا۔ انسان کا اس سے زیادہ حسین کوئی اور محبوب نہیں ہوتا۔

میں قیدی ہوں محبوس ہوں۔ سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوں لیکن اس کے باوجود اس سویرے اور انسان کے خوشگوار مستقبل کے سویرے سے کتنا قریب ہوں سحر کا یہ اڑتا ہوا سپیدہ اور یہ بکھرتا ہوا نورانی غبار میں اسی کی تلاش میں آج سلاخوں میں جکڑ دیا گیا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد دنیا چمکیلی سفید نام روشنی نظر آنے لگی۔ وردی پوش سپاہی آیا اور قفل کھولنے لگا۔ سپاہی نے مجھے دروازے کے پاس کھڑا دیکھا تو پوچھا۔

"بادشاہو۔ آج تو بڑے سویرے جاگ گئے ہو۔ کی گل اے۔ رات نیند نہیں آئی؟"
میں نے مسکراتے ہوئے یونہی کہہ دیا۔

"خاں جی آج میں رہا ہونے والا ہوں۔ سمجھے۔"

سپاہی نے بھی مسکراتے ہوئے بڑے دعائیہ انداز میں کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو جی ——"

یہ کہتے ہوئے اس نے میرے دروازے کا قفل کھولا۔ دروازہ وا ہوا میں نے باہر نکلتے ہوئے سپاہی سے کہا۔

"لو خاں جی —— میں رہا ہو گیا۔" سپاہی ہنس پڑا اور بولا۔

"اچھا تو یہ رہائی ہے۔ اس طرح تو میں روز آپ کو رہا کر دیا کروں گا۔"

ابھی سارے قیدی سو رہے تھے صرف چوہدری اسماعیل صاحب کے کھانسنے کی زود زود کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حوض پر نلکا چل رہا تھا۔ میں ٹوتھ پیسٹ صابن اور تولیہ لیکر پہنچ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک نہاتا رہا۔ صبح سویرے ٹھنڈے اور شفاف پانی سے نہانا بھی کتنا حیات افروز مشغلہ ہوتا ہے۔

نہانے کے بعد میں نے دھلے ہوئے سفید کپڑے پہنے طبیعت بڑی تر و تازہ اور شگفتہ ہو گئی تھی۔ یہ جیل میں مجھے پہلا دن تھا کہ جیل ایک بڑی حسین اور پر فضا جگہ نظر آئی۔

کیا بات ہے آج میں اتنا شگفتہ کیوں ہوں —— ؟ سارے قیدی اٹھ چکے تھے اور مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ میں سویرے سویرے چنبیلی کے پھول کی طرح مہک رہا ہوں۔

ناشتہ آ گیا۔ دو پیالی چائے انڈے لینے کے بعد میں نے کل کا بچایا ہوا ایک ۵۵۵ کا سگریٹ جلایا تو پہلے ہی کش میں جیل شہر نگار نظر آنے لگی۔

میں نے عابدی کو دعوت دی۔

آیئے عابدی صاحب۔ شطرنج کی بساط بچھایئے۔ آج جانے کیا بات ہے بغیر کسی وجہ کے میں بہت خوش ہوں۔ آج میں قہقہے لگانا چاہتا ہوں۔ جیتنا چاہتا ہوں۔ آج میں صرف جیتنا چاہتا ہوں۔ آج شاید میرا یوم فتح ہے۔

شطرنج کی بساط بچھی۔ میں نے چند منٹوں میں عابدی کو ایک مات دیدی اور دوسری بازی میں میں عابدی کے بادشاہ کو گھیرنے ہی والا تھا کہ میرا دوست شاکر بابو تیز تیز ہماری بارک میں آیا اور بولا۔

"جلیس صاحب۔ مٹھائی کھلاؤ۔ تو ایک خوشخبری سنا دوں۔"

کیا۔ کیسی مٹھائی؟ یہاں بھی کوئی احمد کراچی حلوہ مرچنٹ بیٹھا ہے جو تمہیں مٹھائی کھلاؤں۔ البتہ جیل کی مٹھائی گڑ کھانا چاہتے ہو۔ ابھی کچن سے منگوا دوں۔"

شاکر بابو نے مجھے زیادہ بے تاب نہیں کیا اور میری طرف اخبار امروز بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ خبر پڑھ لیجئے۔

میں نے انکے ہاتھ سے اخبار کھینچ لیا۔ خبر کا عنوان پڑھتے ہی میری آنکھوں میں خوشی کی اتنی [illegible] چھا گئی کہ میں آگے نہ پڑھ سکا۔ عابدی نے بلند آواز سے پوری خبر پڑھی۔

ابراہیم جلیس کو رہا کر دیا جائے گا۔

کراچی ۲۰ مئی حکومت کے ایک ترجمان نے بتایا ہے کہ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار مسٹر ابراہیم جلیس کو جنہیں شاہِ ایران کے دورۂ پاکستان کے وقت گرفتار کیا گیا۔ ایک دو روز میں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے گا۔"

ابھی اس خبر پر میرے ساتھیوں کی بھِن بھِن جاری تھی کہ پردھان جی کی طرف سے اپنا اخبار ملّت گجراتی لئے چلے آئے اور دور ہی سے مجھے پکار کر مبارکباد دی کہ جلیس صاحب مبارک ہو۔ ملّت اخبار میں بھی یہی خبر چھپی ہے۔

اب میں ہر ایک سے یہ کہتا تھا کہ مجھے ولی یا کوئی برگزیدہ انسان مانو کیونکہ میں نے آج صبح ہی سپاہی خاں جی سے کہا تھا کہ آج میں رہا ہونے والا ہوں۔ آپ سب میرے ہاتھ پر بیعت کر کے میرے زمرہ مریدی میں شامل ہوں۔ مجھے اپنا پیر و مرشد تسلیم کریں لیکن سب یوں مسکرا رہے تھے جیسے میں نے ابھی ابھی یہ بات گھڑی ہے۔ افسوس کہ خان جی کی ڈیوٹی اس وقت تبدیل ہو چکی تھی ورنہ میں اپنی کھولی کو پیر جلیس شاہ کا تکیہ ضرور بنا دیتا اور ایک قوالی بھی ٹھکوا دیتا۔

ایک دو روز ــــــ اوہ کوئی بات نہیں۔ تین چار روز بھی لگ جائیں تو کیا حرج ہے۔ کوئی حرج نہیں ــــــ میں چیخ پڑا۔

آؤ عابدی صاحب ــــــ تیسری بازی کھیلیں گے۔ آج میرا یوم فتح ہے میں آج آپ کو شکستوں پر شکستیں دے کر نڈھال کر دینا چاہتا ہوں۔

میں شاید چوتھی بازی جیتنے والا تھا کہ بہاڑی کا مقدم شاہ جی آیا اور بولا جلیس صاحب۔ تیاری کرو۔ ایڈمنسٹریٹر کے پاس سے بلاوا آیا ہے۔

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اتنی جلدی ــــــ کہہ دو کہ ہمیں فرصت نہیں ہے ہم اس وقت بادشاہت کو پے در پے شکستیں دینے میں مصروف ہیں۔

لیکن یہ سوچ کر کہ شاہ جی ایک جاہل آدمی ہے۔ پچ مچ لوٹ جائے گا اور یہی کہہ دے گا ــــــ میں نے بڑے پیار سے شاہ جی کو بلایا۔

"سنو تو ــــــ میں بالکل تیار ہوں ــــــ ایک منٹ ٹھہرو میں کپڑے تو بدل لوں ــــــ!"

میں نے جلدی جلدی پتلون، بش شرٹ اور جوتے پہنے اور ساتھیوں سے بولا۔ "آپ سب لوگ نماز پڑھتے رہیئے کہ میں پھر اس منحوس جگہ واپس نہ آؤں۔"

چھ مہینے کے بعد پہلی بار جیل سے باہر نکلا تو دیکھا کہ کراچی بڑے پیار سے اپنی طویل بانہیں پھیلائے مجھے اپنے وسیع و عریض آغوش میں دبوچ رہی ہے۔ ٹرک جیل کی کمپونڈ کے باہر نکلا۔ میں نے آہنی جالی سے جھانک کر حیدرآباد کالونی کو دیکھا۔ حیدرآباد کالونی ــــــ میری ہجرت کی ہوئی جنم بھومی۔ میرے اہل وطن، میرے کئی دوست اور واقف کار مجھے نظر آئے۔ لیکن قیدیوں کی لاری کیبل [illegible] کالٹن روڈ، جمشید روڈ، مظفر اور رشیدہ

بھابی کا مکان، پرانی نمائش، جیکب لائن گرلز اسکول، ایمپریس مارکیٹ، شاہ جی
ہوٹل۔ ساتھی کا دفتر، ریناہوٹل جس کے سامنے میں گرفتار ہوا تھا۔ وکٹوریہ روڈ، کرانگ
ایڈمنسٹریٹر آفس۔ اللہ ــــ یہ بارہا دیکھی ہوئی چیزیں مجھے کتنی نئی معلوم ہو رہی تھیں
جیسے میں کسی اجنبی شہر میں پہنچ گیا ہوں۔ جیسے میں پہلی بار کراچی پہنچا ہوں۔

مجھے ایڈمنسٹریٹر کے اجلاس پر پیش کر دیا گیا۔ ایڈمنسٹریٹر جو لکھنؤ کے
ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ مخصوص لکھنوی تکلف کے ساتھ مجھ سے
ملے۔ بڑے شائستہ انداز میں گفتگو کی۔ اور اپنے ماتحت افسر کو بلا کر حکم دیا کہ ان
کی رہائی کے احکام جیل بھجوا دیئے جائیں۔

میں پھر جیل واپس آیا۔ لیکن اب کے بار مجھے جیل کے پھاٹک کے باہر
ہی روک دیا گیا۔ کیونکہ جیل کے رجسٹر سے میرا نام کٹ چکا تھا۔ میں نے گیٹ
جیلر کی بڑی منتیں کیں کہ اپنی کھولی سے مجھے سامان لے آنے دو۔ اپنے ساتھیوں
سے آخری بار ملنے دو۔ لیکن میری ایک نہ سنی گئی۔ ہر شخص مسکرا مسکرا کر میری
بات ٹال رہا تھا۔ گیٹ جیلر نے میرے واچ مین کے ذریعے میرا سارا سامان
باہر ہی منگوا دیا۔ میں نے قمیض پاجامے واچ مین اور میرے کام کرنے والے
قیدیوں میں تقسیم کر دیئے۔ صرف پتلون اور بش شرٹوں کو تولیہ میں لپیٹ
کر باہر نکلا۔

مصیبت یہ تھی۔ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں کہ میں کم از کم بس میں

بیٹھ سکوں۔ جیل کے احاطہ سے باہر نکل کر میں جیسے ہی حیدرآباد کالونی میں داخل
ہوا۔ میرے حیدرآبادی دوستوں کے ہجوم نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے اپنے بزرگ
دوست ضیاء الدین خاں پوری سے دس روپے قرض لئے اور ایک وکٹوریہ لیکر
میری زندگی کی منزل فاطمہ کی طرف روانہ ہوئی۔ میرا دل خوشی سے تیز تیز دھڑک
رہا تھا۔ کہیں اپنی منزل پر پہنچ کر شادی مرگ نہ ہو جائے۔

گاڑی والے گاڑی تیز چلاؤ۔ بہت تیز ــــ مگر نہیں ــــ

یہاں ٹھہرو ــــ یہاں سے ۵۵۵ کا ایک ٹن لو ایک ماچس لو۔

اب ٹھیک ہے ــــ اب ہوا سے باتیں کرو۔

میں گھر پہنچ گیا۔ سیڑھیوں پر سے ہی پکارنے لگا۔

"شہریار ــــ شہریار میں آگیا۔ میں آگیا۔"

سارے گھر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ دروازے کھل گئے۔ کھڑکیوں کے
پٹ وا ہو گئے ــــ فاطمہ جیسے مجھے نہیں بلکہ ایک خواب دیکھ رہی تھی ــــ
بچے دوڑ کر چمٹ گئے تھے۔ اور میں ایک پھل دار درخت کی طرح
جھول رہا تھا۔

میرے اطراف میرے چھوٹے بھائی کے سسرال عزیز، دادی اماں،
پھوپھی جان، فاروق، امجد، محمودہ، نصیر سب جمع تھے۔

عرصۂ دراز سے سنگین دیواروں۔ لوہے کی سلاخوں اور وردی پوش

انسانوں کے تنگ حلقے میں جکڑی ہوئی میری زندگی ایک دم وسیع ہو گئی تھی جیسے کہ زمین کے افقی کناروں کو چھونے لگی تھی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس وسیع اور بیکراں دنیا میں چیختا پھروں کہ

جیل تمہاری ہے مستقبل ہمارا ہے
جیل تمہاری ہے زندگی ہماری ہے

اب میں لوہے کی سلاخوں بڑے بڑے پتھروں اور خاکی وردیوں کی جیل سے باہر ہوں۔ لیکن سونے کی اینٹوں اور چاندی کی سلاخوں والی جیل میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ لیکن کیا پرواہ ہے۔ آج ساری دنیا میں جگہ جگہ اس جیل کو بھی توڑا جا رہا ہے ——————

اور دنیا کا ہر نیا انسان ہر پرانے انسان کو للکارتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے کہ

جیل تمہاری ہے دنیا ہماری ہے
ماضی تمہارا ہے مستقبل ہمارا ہے
موت تمہاری ہے زندگی ہماری ہے

ابراہیم جلیس

وہ گل برگ دکن کی خاکِ دانش کا سمن تھا
جسے عثمانیہ نے رنگ و بو بخشا
وہ ایسی سرزمیں کا سانولا اہلِ قلم تھا
جس کے خوشبو سے گلستانِ دکن باغِ ارم تھا
بہاروں میں کہیں آ جائے کچھ ایسا
فسانہ بن گیا حرفِ جنوں بھی
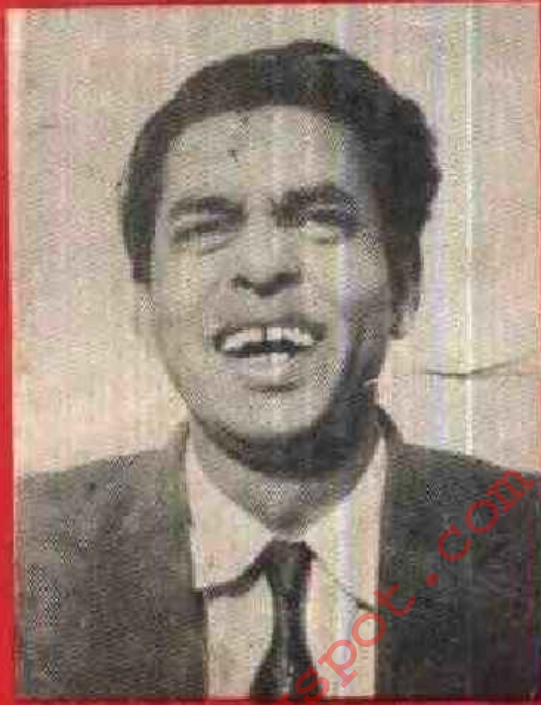
قلم لکھتا رہا ایسی کہانی
جس کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا
اسے جس نے پڑھا اب بھی پڑھا ہے
خرد مندوں کے حق میں تازیانہ بن گیا اسلوبِ فن اس کا
قلم کیا جیسے طوق و سلاسل، وہ جیتا اور سب ہارے

وہ افسانہ کہ ملکوں کی کہانی بن گیا ہے
نہ مٹنے والی اک نشانی بن گیا ہے